عصر تارا

ہم عصروں کی بات ہوئی تو ناصر کاظمی ؔ نے میر ؔ کے ساتھ سرسوں کے پھول کو بھی اپنا ہم عصر مان لیا۔ زرد پھول کی دھوپ میں چمکتی ہوئی پتیوں میں ناصر ؔ کو مہذب اداسی کی کوئی ایسی کیفیت نظر آئی ہو گی جس کا رشتہ ان کی شاعری کے نازک لہجے سے ملتا ہو گا۔ ناصر ؔ کی پیروی میں جب میں اپنے ہم عصر تلاش کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کسی پرندے کو یا کسی شجر کو اپنا معاصر کہہ دوں مگر ان سے بھی پہلے ایک تارا میرا ہم عصر ہے۔ فلک کی دھندلی نیلاہٹ میں سلگتا ہوا تارا، کسی دوست کی تسلی کی طرح، کسی امکان کی طرح، شاعری کے کسی نئے اسلوب کی طرح میری آنکھوں کے سامنے جھلملاتا ہے۔

ثروت ؔ حسین کی نظموں اور غزلوں میں تاروں کی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی روشنی دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے میرا ہم عصر تارا ثروت ؔ کا بھی ہم عصر ہے اور اس نے اس تارے سے کچھ ایسی رمزیں بھی سیکھ لی ہیں جو اس نے مجھے بھی نہیں بتائیں۔ یوں اس ہم عصر کے وسیلے سے ثروت ؔ حسین میرا ہم عصر ہے۔ اپنے زمانے کے بہت سے شاعر انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں: کسی کا آشوب، کسی کی لفظیات اور کسی کے شعری دائرے کا پھیلاؤ دل کو لُبھاتا ہے مگر سچی ہم عصری کا احساس کسی کسی ہی میں ہوتا ہے۔ ثروت ؔ حسین کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے ہوئے فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم اسی کائنات میں سانس لے رہے ہیں جس میں مظاہر اپنی اوّلین اور شفّاف صورت میں موجود ہیں۔ اپنا آشوب بھی برحق، کہ کون اس سے آزاد ہو سکتا ہے، گرد و پیش کا غبار آلود ہونا بھی مسلم، کہ ہماری سانسیں ہر لمحہ اس پنی شاعری میں اپنے رویاء ہیں کائنات کو کسی اور ہی آن میں دیکھا ہے اور تاروں، ا کی گواہی دیتی ہیں مگر شاعر نے : پھولوں، درختوں، بستیوں اور انسانوں سے عاشق کا رشتہ جوڑ لیا ہے۔ رِلکے کی ایک مختصر نظم ہے

دنیا محبوب کے چہرے میں تھی"

لیکن ایک دم اُنڈیلی گئی

دنیا باہر ہے، یہ ناقابلِ فہم ہے

میں نے اسے تب کیوں نہ پیا جب اٹھایا تھا

محبوب کے پورے چہرے سے

دنیا اتنی قریب، میں نے اس کو چکھا

اوہ! کیا میں نے بے صبری سے پیا

میں پہلے ہی اتنا لبریز تھا، دنیا سے

"کہ جب میں نے پیا تو چھلک اُٹھا

: ثروت حسین کی نظموں اور غزلوں میں یہی چھلک جانے کی کیفیت ہے۔ رِلکے ہی نے نویں نوحے میں کہا ہے

۔۔۔زمین میری محبوبہ۔۔۔یقین کرو"

مجھے اپنا بنانے کے لیے تمھیں اپنی اور بہاروں کی ضرورت نہیں

صرف بہار کا ایک موسم آہ۔۔۔۔صرف ایک بھی

"میرے لہو کی برداشت سے باہر ہے۔

جب ثروت حسین کو ملازمت کے سلسلے میں اندرونِ سندھ جانا پڑا تو اس نے ایک بار پاک ٹی ہاؤس کے باہر فٹ پاتھ پر مجھے اس تجربے کے تاثر سے آگاہ کرتے ہوئے کہا: " زمین کو دیکھنا عجیب سا تجربہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں زمین ماں ہے، ماں بھی ہو گی مگر مجھے تو اس سفر میں یہ محبوبہ کی طرح دکھائی دی۔" ماں ہو یا محبوبہ، یہ عورت ہی کے روپ ہیں مگر ثروت نے زمین سے شفقت سے زیادہ رفاقت طلب کی ہے اور شاید رفاقت کے حصول سے بھی زیادہ اسے اپنی عاشقانہ وارفتگی سے سروکار ہے۔ وہ کاندھے پہ ساز دھرے سفر کرتا ہے اور فطرت میں تحلیل ہو جانا چاہتا ہے۔ س کا نشاطیہ لہجہ اپنے اندر عبودیّت اور تشکر کی کیفیات کو لیے ہے۔ وہ بھی نرودا کی طرح اپنے سیّارے کو تبدیل

نہیں کرنا چاہتا جہاں عورت کا جسم، کھیت، گھنٹیوں کی آوازیں، سمندر، جزیرے، کھپریل، عبادت گاہیں اور مکتب موجود ہیں۔ زمین کا جادو اُس کے حواس پر چھایا ہوا ہے:

گردشِ سیّار گاں خوب ہے اپنی جگہ

اور یہ اپنا مکاں خوب ہے اپنی جگہ

ہمارے ہاں شاعری میں خطابت عام ہے اور شاعر تجربے کا عکس پیش کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور اکثر اپنے رویاء کی وضاحت بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں اس شعری اسلوب کی کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں، صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ثروت اس دائرے کا شاعر نہیں اس لیے اُس کی نظموں اور غزلوں کی تفہیم اس دائرے کے شاعروں کے شعری اصولوں کی مدد سے پوری طرح نہ ہو پائے گی۔ ثروت حسین کا تعلق اس شعری دائرے سے ہے جہاں جہاں چھوٹی چھوٹی تصویریں کسی وضاحتی طوالت کے بغیر، اپنے اندر احساساتی اشاریت کو سمیٹ لیتی ہیں۔ ایسی شاعری کی تفہیم کے لیے شاعر کی مخصوص شعری زبان، اس کے رویاء کی وحدت اور اس کی تمثالوں کے جھرمٹ کی بدلتی ہوئی رنگا رنگ کیفیتوں کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی طور پر ثروت حسین نے عض شعری عناصر اور احمد مشتاق سے ذہنی ب منیر نیازی، ناصر کاظمی، محمد سلیم الرحمٰن اور کہیں کہیں مجید امجد کے قربت محسوس کی ہے اور ہسپانوی زبان کے شعرائیں اسے لورکا کی نظموں میں تخلیقی کرب اور نشاطِ تخلیق کی کشمکش اور اس کی نظموں کے زمینی مناظر نے مسحور کیا ہے اور پابلو نرودا کے ہاں چھوٹی چھوٹی زمینی اشیاء سے مسرّتوں کا رس نچوڑ لینے کی ادا اور ان اشیاء کو کائناتی عمل میں پرو کر دیکھنے کی ادا سے بھی وہ متحیّر ہوا ہے۔ ہر دائرے کی اپنی حدود ہوتی ہیں مگر ہر دائرہ بعض شعری عناصر کو اتنا چمکا کر سامنے لاتا ہے جو دوسرے میں اوجھل رہے تھے۔ ثروت حسین جس دائرے کا شاعر ہے وہ شاعری کے ازلی سوتوں کے قریب تر ہے اور ہمارے عہد کی اداکارانہ خطابت سے کہیں گہرے تاثر کا حامل ہے۔

ثروت حسین کی شعری تمثالوں کے کئی علاقے ہیں۔ایک طرف ان کا تعلق کائنات کی فطری حالت سے ہے۔ گردشِ سیّارگاں،ثابت و سیّار، کہکشاں،آسماں،لہریں لیتا دریا، جزیرہ نما، پہنائے بحر و بر، ہوائیں، سمندر، دشت و در، دریا،ستارے، درخت، پرندے اس طرح کی تمثالیں اس شاعری کے گرد حاشیہ کھینچتی ہیں پھر اس ماحول میں انسانی تلازمات ظاہر ہوتے ہیں۔ مضافات، گاؤں، لڑکیاں، محنت کرنے والے ہاتھ، اچھے لوگ، بندرگاہوں پر کام میں مصروف انسان، منڈیریں، چھاج پھٹکتی ہوئی کلائیاں، مگن مکھ جھونپڑیوں میں جلتے چولھے، کھیلتے گرد اُڑاتے بچے ماہی گیر، نانبائی، گڈریے، کسان اس حاشیے ک اندر مختلف تصویروں کی صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر ایسی تمثالیں ہیں جو تہذیبی جہت رکھتی ہیں:

قریب ہی کسی خیمے سے آگ پوچھتی ہے
کہ اس شکوہ سے کس قرطبہ کو جاتا ہوں

اسی جزیرۂ جائے نماز پر ثروتؔ
زمانہ ہو گیا دستِ دعا بلند کیے

گونجتی گلیوں میں ہے ان کے خیالوں کی چاپ
گشت و گلیم آشنا، پاک پیمبر ترے

کوئی نور ظہور کرے ثروتؔ
اسی حمد الحمد کی جالی پر

اس جہت کے ساتھ اُس جہت کی تمثالیں جن کا تعلق قریبی زمین بالخصوص سندھ کی سرزمین سے ہے۔(بنگال کے حوالے سے اس کی نظم " ایک انسان کی موت" کتنی پرتاثیر ہے)۔مہران کا پانی، کوہ یارا، وائی اور کافی کا اسلوب، ان عناصر نے ثروت حسین کے رویاء میں ایک نئی معنویت بھر دی ہے۔"زمین، زمین" کا نعرہ لگانے والے شاعر تو بہت مل جائیں گے مگر زمین کو اتنی متنوع جہتوں میں دیکھنے والے شاعروں کی تعداد زیادہ نہیں۔ کہنے کی کچھ باتیں اور بھی ہیں، ثروت کی غنائیت اور دیگر فنی پینترے، اس کی لفظیات، ان نظموں کی معنویت کی دوسری سطحیں اور دوسرے موضوعات، مگر ان چیزوں کی پہچان شاعر کے رویاء کی پہچان کے بعد ہی ممکن ہے۔"آدھے سیّارے پر" اُردو شاعری کا ایک نیا امکان ہے۔ ثروت حسین کے ہم عصر ستارے کی طرح ایک نئی اُمید۔

فروری 1985، لاہور

سہیل احمد

***

مرحوم اباجی کے نام

کہیں بھی ہو وہ ستارہ یہاں سے دور نہیں

(ثروت)

***

نظمیں

یہ ابر یہ بوچھار
اس خواب میں ہم کو
چلنا ہے لگاتار
***

ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے

ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے
جوتوں کی جوڑی سے
یا قبر سے جو بارشوں میں بیٹھ گئی
یا اس پھول سے جو قبر کی پائنتی پر کھلا
ہر ایک کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی
چیونٹیوں کو جاے نماز کے نیچے
اور لڑکیوں کو میری آواز میں
مردہ بیل کی کھوپڑی میں گلہری نے گھر بنالیا ہے

نظم کا بھی ایک گھر ہو گا

کسی جلاوطن کا دل یا انتظار کرتی ہوئی آنکھیں

ایک پہیہ ہے جو بنانے والے سے ادھورا رہ گیا ہے

اسے ایک نظم مکمل کر سکتی ہے

ایک گونجتا ہوا آسمان نظم کے لیے کافی نہیں

لیکن یہ اک ناشتے دان میں بہ آسانی سما سکتی ہے

پھول، آنسو اور گھنٹیاں اس ہیں پر وئی جا سکتی ہیں

اسے اندھیرے میں گایا جا سکتا ہے

تہواروں کی دھوپ میں سکھایا جا سکتا ہے

تم اسے دیکھ سکتی ہو

خالی برتنوں، خالی قمیصوں اور خالی گہواروں میں

تم اسے سن سکتی ہو

ہاتھ گاڑیوں اور جنازوں کے ساتھ چلتے ہوے

تم اسے چوم سکتی ہو

بندرگاہوں کی بھیڑ میں

تم اسے گوندھ سکتی ہو

پتھر کی ناند میں

تم اسے اُگا سکتی ہو

پودینے کی کیاریوں میں

ایک نظم

کسی بھی رات سے تاریک نہیں کی جاسکتی

کسی تلوار سے کاٹی نہیں جاسکتی

کسی دیوار میں قید نہیں کی جاسکتی

ایک نظم

کہیں بھی ساتھ چھوڑ سکتی ہے

بادل کی طرح

ہوا کی طرح

راستے کی طرح

باپ کے ہاتھ کی طرح...

***

وصال

خوشبو کی آواز سنی

غنچہ ٔلب کے کھلتے ہی

پانی پر کچھ نقش بنے

پرتوِ شاخ کے ہلتے ہی

ساری باتیں بھول گئے
اس سے آنکھیں ملتے ہی
***

بارشوں میں

ٹہنیاں بادل نہ ہو جائیں کہیں
بستیاں اوجھل نہ ہو جائیں کہیں
لڑکیاں پاگل نہ ہو جائیں کہیں
***

چاہت

آدمی، پیڑ اور مکان
صاف نیلا آسمان
سنگ ریزے اور گلاب
سب کے سب اچھے لگے
اس کے گھر جاتے ہوئے
***

یہ گیت تمھارا گھر ہے

آنکھوں سے زیادہ گہرا
کرنوں سا گرم سنہرا
آوازوں سا ترو تازہ
تاروں سا بے اندازہ
یہ گیت — تمھارا گھر ہے

***

ستارے کا گماں

سایہ ہے گہری چپ کا اکیلے مکان پر
دل مطمئن بہت ہے مگر اس گمان پر
روشن ہے اک ستارہ ہمارے بھی نام کا
پیڑوں کی چوٹیوں سے اُدھر آسمان پر

***

بہتا ہوا پانی

بہتا ہوا پانی

پیڑوں کے ماتھے کو

چوم گئے بادل

شاخوں سے ٹکرائیں

ہات—

کچے پھلوں کی

خوشبو جگائے

سُورج کی بانہوں میں

رات—

بہتا ہوا پانی

***

بندرگاہ میں گرم پُرشور دِن کا آغاز

سورج دیکھنے والی آنکھ

محنت کرنے والے ہاتھ

گیلے تختے، جلتے پیر

اچھے لوگو! صبح بخیر

***

دن اور جھاگ

دھوپ
اور
دوریوں کے درمیان
ایک آواز سنائی دیتی ہے
جیسے مچھلی
سیاہ جال سے بے خبر
سنہری پروں سے
پانی کاٹتی ہے—

***

پانی کا ہاتھ

اُجلے پرندو! وہ دن کتنا میلا ہو گا
آسمان بہت دور دور تک پھیلا ہو گا
میں کشتی کے فرش پہ گر جاؤں گا تھک کر

پانی کا ہاتھ سلا دے گا مجھے تھپک تھپک کر

***

ادا سی کا گیت

شام ہوئی، آنسوؤں میں بھیگنے لگے
لڑکیوں اور پھولوں کے ان گنت نام
کہیں کسی پڑاؤ پر رُکے ہوے لوگ
کہیں کسی الاؤ پر جھکے ہوے پیڑ
سفر کیا بادلوں نے تارے کے بغیر

***

یہ مرے خواب کا مکاں

کتنے برس گزر گئے
کوئی چراغ، کوئی پھول
تم نے مجھے دیا نہیں
خواب مرے سنے نہیں
چاک مرا سیا نہیں

صبح کے بعد دوپہر

شام میں ڈوب جائے گی

شام کے بعد رات ہے

رات کے بعد پھر کہاں

یہ مرے خواب کا مکاں

***

یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے

پرندوں اور بادلوں سے خالی آسمان کے نیچے کسی دور دراز اسٹیشن کے برآمدے میں ریت بھری بالٹیاں اور ایک بھاری زنجیر... جنگلے کو تھام کر پھیلتی ہوئی بیلیں، رُکی ہوئی مال گاڑی کے پہیے اور پتھروں کی ابدی خاموشی میں قریب آتی ہوئی یاد، کبھی کبھی چمکنے والی بجلی کی چکا چوند میں آبائی مکان کی جھلک، جہاں کیاریوں کے پاس ایک بیلچہ بارشوں میں ... بھیگ رہا ہے

کوئی ہمارا نام لے کر پکارتا ہے، کیا وہ لڑکی اب بھی کسی کھڑکی پر کہنیاں ٹکائے ہمیں اداسیوں کے سرسراتے جھنڈ سے گزرتے دیکھ سکتی ہے... یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے۔

***

پھول کی حکایت

بس اتنا یاد ہے

سرخ پنکھڑیوں والا ایک پھول تھا
جو دھول بھرے سمندر سے گزرتے ہوے گم ہوا
اے خوب صورت آنکھوں والی لڑکی
قریب آ،
—وہ پھول تجھ میں جل رہا ہے

***

ٹوٹ گئی چھاؤں

ٹوٹ گئی چھاؤں
دودھیا منڈیر ہے
میدانوں، مکانوں میں سویر ہے
چھاج پھٹکتی ہوئی کلائی سنگیت ہے
بانس کی کھپچیوں پہ، بیلوں کے جھکاؤ میں
آسمانی پلوؤں پہ دُھوپ ہے
کھیتوں سے کھیلتی کھجور کی چٹائیاں
بھید بھرے پتھروں پہ
گونجتی کھڑاؤں!

***

پرانے دوستوں کی ناراضگی

سورج نے گھور کے دیکھا
پتوں نے شور کیا
ہوا نے بڑھ کر جھرنے کے گیتوں کو سمیٹ لیا
ہریالی میں اُگے ہوے تاروں نے مجھ سے
بات نہ کی
—— میں لوٹ آیا

***

بچپن اور اُداسی کی حد پر

میں اپنے خوابوں کے ساتھ گزرتا ہوں
اونچائی سے گرتی رات میں دیواروں، دروازوں کی پہچان
بہت مشکل ہے
ویسے بھی

رُک جانے، ستانے والے دیواروں کا حصّہ ہیں
——دُھوپ چمکتی ہے
بچپن اور اداسی کی حد پر میدان
فراکوں اور گلدستوں سے بھر جاتا ہے
——یا شاید اک بنچ
یا پھر سال مہینے پُلوں، سُرنگوں اور آئینوں پر نیند کے جھونکے
ایک مسلسل چیخ اُڑائے لیے جاتی ہے
اتنی تیز ہوا میں اطمینان کا سانس!
تمھارے لہجے میں دیوار سنائی دیتی ہے
دیواروں سے بچتا چھپتا
——میں اپنے خوابوں کے ساتھ گزرتا ہوں
***

دشوار دن کے کنارے

خوابوں میں گھر لہروں پر آہستہ کھلتا ہے، پاس بلاتا ہے، کہتا ہے، دھوپ نکلنے سے پہلے سو جاؤں گا، میں ہنستا ہوں، لڑکی تیرے ہاتھ بہت پیارے ہیں، وہ بھی ہنستی ہے، دیکھو لالٹین کے شیشے پر کالک جم جائے گی، بارش کی یہ رات بہت کالی ہے، کچے رستے پر گاڑی کے پہیے گھاؤ بنا کر کھو جاتے ہیں، ایک ستارہ——بیس برس کی دوری پر اب بھی روشن ہے
***

گیت کے ایک کنارے پر

گیت کے ایک کنارے پر میں، دوسری جانب رنج، خوشی اور خوابوں کی آزاد زمینیں، گیت کے رُخ پر کھلتے در اور چڑھتی بڑھتی بیلوں کی پیچیدگیوں میں اک اک کر کے کھلتے تارے، گیت کنارے دھوپ، مویشی اور مگن مکھ جھونپڑیوں میں جلتے چولھے، کھیلتے گرد اُڑاتے بچوں کی مٹ میلی صبحیں، شامیں میٹھی نیندوں کی برکھا سے جل تھل، جیسے دور دراز جگہوں سے بہتے سہتے آ گرتے ہیں گیتوں میں گیتوں کے دھارے

***

اسی دالان بھر تنہائی کی حد پر

اسی دالان بھر تنہائی کی حد پر ستاروں کو ہوا سے گفتگو کرتے گزرتے، صبح کے ہمراہ مٹی کے پیالوں پر اترتے گھونٹ بھرتے، آدھ کھلے جُزدان سے سیر اب آئینوں کے رُخ پر سرمئی شمعیں جلاتے دیکھنا اور بھول جانا

***

صدی کے چوتھائی ٹکڑے پر

صدی کے چوتھائی ٹکڑے پر جھپٹنے والے ہزاروں چاند اور سورج یا صرف ایک دن گرم پُر شور، نمازوں اور لڑکیوں کے جُھنڈ میں راستہ بناتا ہوا... ہوائیں، برآمدے اور احاطے، گھی لگی روٹیوں سے آگے کتابوں میں رینگتی ہوئی تہذیب ...

پانی کی زندگی یا پانی کی موت، لڑکیوں کی ہنسی پانی کے سانپ کی طرح سفید بے زہر... دونوں پتواروں نے ایک ہی کشتی سے چاند کو گلابی ہوتے ہوئے دیکھا اور پانی پر پہلا پیوند لگا یا ...

***

پھر وہی آگ

پھر وہی آگ
دہرائی گئی اس شام
پتھر سے تراشی ہوئی میز کے گرد
وہ شعلوں کے بدلتے ہوئے رنگ میں بھی خاموش رہے
اور ہم سے کوئی بھید چھپا نہ سکے:
اندھیری کوٹھریوں میں
روشندان نہیں بنائے
کہ ستارے ستانے کو آبیٹھتے ہیں
دکھی ہوئی پوروں کے لیے

آوازوں کے نُچے ہوئے پنکھ بہت

تالیوں اور جھنڈیوں کے دوسرے کنارے

گھوڑوں کے بجتے سُم

اور چابکوں کے تیز جھکّڑ

آرائشی محرابوں کو بہالے گئے

چوتھی دستک پر

دروازہ کھولنے والے سہم گئے

درزوں اور دراڑوں سے

خبریں چھن چھن کر آتی ہیں

دُوراندیش درختوں کی خلعت

چھیننے والے

گلی گلی میں

دھول بھرے پہناوے بانٹ رہے ہیں

***

آدھے سیّارے پر

پھولوں

اور پھلوں کی بہتات میں

کسی کو نیند نہیں آئی

چبوتروں،

اناج گھروں کو

سراہتے ہوے

غلّہ گاہنے کے سمے

کتابوں،

ہتھیاروں کو قید

گیتوں کو رہائی

دشمنی کو زمہریر ——

کوئی بول

ہواؤں کی حدوں کو

چومتا ہوا

کہ آدھے سیّارے پر

اب بھی سورج کا چراغ

جھومتا ہے ——

***

لفظوں کے درمیان

دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے سیّارے کو لفظوں سے بھر دیا

فیصلوں اور فاصلوں کو طول دینے کا فن انھیں خوب آتا ہے

جہاز بندرگاہوں میں کھڑے ہیں

اور گھروں، گوداموں، دکانوں میں

کسی لفظ کے لیے جگہ نہیں رہی

اتنے بہت سے لفظ — اُف خدایا!

مجھے اس زمین پر چلتے ہوئے اٹھّائیس برس ہو گئے

باپ، ماں، بہنوں، بھائیوں اور محبوباؤں کے درمیان

انسانوں کے درمیان

میں نے دیکھا

تعریفوں، تعارفوں اور تعزیتوں کے لیے

ان کے پاس لرزتے ہوئے ہونٹ ہیں

ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ہیں

گرم ہتھیلیاں ہیں

انھیں کسی ابلاغ کی ضرورت نہیں

نانبائی گنگناتا ہے

اسے لفظ نہیں چاہیے

ایک ناند — آٹا گوندھنے کے لیے

ایک تختہ — پیڑے بنانے کے لیے

ایک سلاخ—— تنور سے روٹی نکالنے کے لیے

نانبائی، کام ختم کرلو تو میرے پاس آنا

یہاں کنارے پر سرکنڈوں کا جنگل آپ ہی آپ اُگ آیا ہے

کچھ قلم میں نے تراشے ہیں

——اور ایک بانسری

باقی سرکنڈوں سے ایک کشتی بنائی ہے

گڈریا، کسان، دستکار، موسیقار، آہن گر

سب تیار ہیں

کچھ آوازیں کشتی میں رکھ لی ہیں

—— مدرسے کی گھنٹی

ایک لوری

اور ایک دعا

اک نئی زمین پر زندہ رہنے کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے

***

ایک انسان کی موت

!رُک کیوں گئے تمھارے ہاتھ موجمدار

گنا پیلنے کی مشین کا پہیہ رُک گیا

زمین رک گئی

آدھے سیّارے پر ہمیشہ کے لیے رات آگئی
لالٹین کون جلائے گا؟
ہوائیں گزرتی ہیں پتوں کو گراتی ہوئی
میلاد کی کتاب کے ورق اُڑ رہے ہیں
باہر الگنی پر بنیان سوکھ رہا ہے
ٹنکی کی ٹونٹی سے پانی گر رہا ہے
یہ اتنے سارے کام کون کرے گا موجدار!
رُک کیوں گئے تمھارے ہاتھ
دیکھو! رانگاماٹی پر دن نکل آیا ہے
بانس کے درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں
ہتیا اور بھولا کو نمودار ہوتے ہوئے نہیں دیکھو گے کیا؟
تمھارے بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ گھاٹ سے کشتی کھول رہے ہیں
ان سے نہیں ملو گے کیا؟
وہاں کرشنا چورا کے سایے میں
تمھاری بیوی کی قبر
انسانوں اور بادلوں کو گزرتے دیکھتی ہے
کیا فاتحہ نہیں پڑھو گے؟
اگر بتّی نہیں جلاؤ گے موجدار؟

تم میری زبان جانتے تھے
میں تمھاری زبان نہیں جانتا لیکن آج تمھارے سرھانے
ایک گیت کے بول دہراتا ہوں
!گاؤ موجمدار
جیسے بچے گاتے ہیں
:جیسے بوڑھی گنگا گاتی ہے
شو کولے اُٹھیا''
امی مونے مونے بولی
شارادن امی جانے
بھالو ہوے چولی
آدیش کورے جہان
مور گرو جانے
امی جانے شئی کاج
—''کوری بھالو مانے
رُک کیوں گئے—بولتے کیوں نہیں موجمدار؟
!تمھیں کیلے کے باغوں اور پانی سے پیار تھا نا
ہم تمھیں کیلے کے پتوں میں کفنائیں گے
تمھاری قبر پانی میں بنائیں گے
! موجمدار

فوجی بوٹ دھان کی پنیری سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے
نہیں
دھان کی پنیری فوجی بوٹ سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے
!اس بوٹ میں میرا پاؤں تھا موجمدار
لو یہ گنّا چھیلنے کی کٹار
کاٹ دو اس پاؤں کو
الگ کر دو اسے
مجھے اپنے پاؤں سے خوف آتا ہے
مجھے مُردہ آدمی کی ہنسی سے خوف آتا ہے
مجھے رُکی ہوئی زمین سے خوف آتا ہے
!رُک کیوں گئے تمھارے ہاتھ موجمدار
***

درخت، میرے دوست

درخت، میرے دوست
تم مل جاتے ہو کسی نہ کسی موڑ پر
اور آسان کر دیتے ہو سفر ——
تمھارے پیر کی انگلیاں

جمی رہیں پاتال کے بھیدوں پر
قائم رہے مرے دوست
تمھارے تنے کی متانت اور قوت
دھوپ اور بارش تمھیں اپنے تحفوں سے نوازتی رہے
تم بہت پُر وقار اور سادہ ہو
میرے تھیلے کو جاننا چاہتے ہو
ضرور—— یہ لو میں اسے کھولتا ہوں
روٹیاں، دعائیں اور نظمیں
میرے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں
ایک شاعر کے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا
اگر میرے پاس ایک اور زندگی ہوتی
تو میں اپنی پہلی زندگی
تمھاری جڑوں پر گزار دیتا
مگر میں گھر سے خاندان بھر خوشیوں کے لیے نکلا ہوں
اور وہاں میرا انتظار کیا جا رہا ہے
تم نے، مرے دوست
ہاں تم نے
بہت کچھ سکھایا ہے مجھے
مثلاً زمین اور آسمانی بجلی

اور ہوا

اور انتظار

اور دوسروں کے لیے زندہ رہنا

بہت قیمتی ہیں یہ باتیں

میں کیا دے سکتا ہوں اس فیاضی کا جواب

میرے پاس تمھارے لیے

ایک روٹی اور دُعا ہے

روٹی: تمھاری چیونٹیوں کے لیے

دعا: تمھارے آخری دن کے لیے

مجھے معلوم ہے تم نے کلھاڑی کے مصافحے

اور آری کی ہنسی سے کبھی خوف نہیں کھایا

مگر تم روک نہیں سکتے انھیں

کوئی بھی نہیں روک سکتا

——خدا کرے

خدا کرے تمھاری شاخوں سے ایک جھونپڑی بنائی جائے

بازوؤں کے گھیرے میں نہ آنے والے تمھارے تنے کی لکڑی

بہت کافی ہے

دو پہیوں اور ایک کشتی کے لیے

دوست ! ہم پھر ملیں گے

مسافر اور چھکڑا
مسافر اور کشتی
کہیں نہ کہیں ہم پھر ایک ساتھ ہوں گے
کہیں نہ کہیں
ایک ساتھ — ہم سامنا کریں گے
ہوا کا
اور راستوں کا
— مسرت کا اور موت کا

***

میں تمھیں یاد کر رہا تھا

جب درخت خاموش تھے
اور بادل شور کر رہے تھے
میں تمھیں یاد کر رہا تھا
جب عورتیں آگ روشن کر رہی تھیں
میں تمھیں یاد کر رہا تھا
جب میدان سے ایک بچے کا جنازہ گزر رہا تھا

میں تمھیں یاد کر رہا تھا
جب قیدیوں کی گاڑی عدالت کے سامنے کھڑی تھی
میں تمھیں یاد کر رہا تھا
جب لوگ عبادت گاہوں کی طرف جا رہے تھے
میں تمھیں یاد کر رہا تھا
جب دنیا میں ہر شخص کے پاس ایک نہ ایک کام تھا
میں تمھیں یاد کر رہا تھا

***

ملّاح کا دل

کسی نے نہیں دیکھا
ملاح کا دل
یہاں تک کہ شام آگئی
وہ گر پڑا
ایک اُونچے مستول سے
کبھی نہ اٹھنے کے لیے
کسی نے نہیں دیکھا
ملّاح کا دل

جب وہ پھینک دیا گیا
پتھر کی طرح
گہرے پانی میں
کسی نے نہیں دیکھا
ملّاح کا دل
——اور اس میں سوئی ہوئی ایک لڑکی کو
کسی نے نہیں دیکھا
***

پیپر ویٹ

پیپر ویٹ
ٹھوس شیشے کا بنا ہوا ہے
جس کے اندر
پھول ہیں
جیسے سمندری تہہ میں
کھلتے ہیں
آٹھ جل پریاں ہیں
جو رقص کر رہی ہیں

پیپر ویٹ

اس لیے ہے کہ

کاغذ کو ہوا کی زد سے محفوظ رکھے

پیپر ویٹ

ایک سیارہ ہے

جس میں لوگ رہتے بستے ہیں

لیکن پیپر ویٹ ان سب باتوں سے بے خبر ہے

اسے تو صرف

شاعر کی آنکھ نے زندگی دی

اور مار دیا

***

صبح ہوتے ہی

صبح ہوتے ہی آٹھ کروڑ مسخرے نکل آتے ہیں سڑکوں پر

اور شروع کر دیتے ہیں ناچ

آٹھ کروڑ مسخرے نکل آتے ہیں اپنے رنگے چہروں اور لمبی ٹوپیوں

کے ساتھ

توڑ پھوڑ ڈالتے ہیں آسمان

دھجّی دھجّی کر دیتے ہیں دھوپ

الجھا لیتے ہیں ہوا کی ڈور اپنے ہاتھوں میں

راستہ نہیں دیتے میّت گاڑیوں کو اور آگ بجھانے والے انجن کو

بھر دیتے ہیں سیّارے کو بیہودہ فقروں سے

اور شام آتی ہے

لوٹ جاتے ہیں سورج کے ساتھ کورس گاتے ہوئے

اور رات ہوتی ہے

اور صبح ہوتی ہے

صبح ہوتے ہی آٹھ کروڑ مسخرے نکل آتے ہیں سڑکوں پر

اور شروع کر دیتے ہیں ناچ—

***

دس سے اوپر

اتنے گھر

اتنے سیارے

کنکر پتھر کون گنے

دس سے اوپر کون گنے

اوزاروں کے

نام بہت ہیں

ہتھیاروں کے

دام بہت ہیں

اے سوداگر کون گنے

دس سے اوپر کون گنے

اے دل

اے بے کل فوارے

کتنے گھاؤ بنے ہیں پیارے

اپنے اندر کون گنے

دس سے اوپر کون گنے

کتنی لہریں ٹوٹ گئی ہیں بیچ سمندر، کون گنے

***

یہاں مضافات میں

یہاں مضافات میں اس وقت

ٹھیک اِس وقت

جب زمینی گھڑیاں صبح کے ساڑھے سات بجا رہی ہیں

ایک پہیہ بنایا جا رہا ہے
لکڑی کے تختوں کو گولائی دینا معمولی کام نہیں
اپنے وسط سے باہر پھوٹتی ہوئی روشنی
عورت کے برہنہ جسم کے بعد یہ پہلا منظر ہے
جس نے مجھے روک لیا ہے
اور میں بھول گیا ہوں کہ سیّارے پر کوئی موسم بھی ہے
اور میرا ایک نام بھی ہے
پہیوں کی ایک جوڑی دروازے سے لگی کھڑی ہے
گاڑی بان آئے گا اور اسے لے جائے گا
—— گاڑی بان آئے گا اور یہ دو پھول لے جائے گا
***

دورویہ خوشیوں میں

——سندھڑی
جییں تیرے بیٹے
دورویہ خوشیوں میں
دور تک
بہے جائیں

پکھی

تیری چونچ میں

مکئی کا تارا رہے

کارونجھر سے

اونٹوں والے

آئے ہیں

جھونپڑیاں

مہک اُٹھیں

جانور کی مانی سے

کٹورا بھریں

پانی سے

سندھڑی

تیری بیٹیاں

رلّیاں بناتی رہیں

گاتی رہیں

رنگین ٹکڑوں کو

وحدت میں ملاتی رہیں

***

مہران مجھے دو

مہران، مجھے دو
آواز کا اک پنکھ
مہران، مجھے دو
ٹوٹے ہوے رشتے
پرکھوں کے نوشتے
مہران، مجھے دو
زرخیز کنارا
یہ ہاتھ تمھارا
گرم اور سنہرا
مہران، مجھے دو
اُمید اور پانی
***

وائی

کوہ یارا، کوہ یارا
دیکھ پچھم کے کنارے

چیختے رنگوں کا دھارا

کوہ یارا، کوہ یارا

دور نیچے بستیوں سے

لہلہاتی پستیوں سے

دیکھتا ہے گھر تمھارا

کوہ یارا، کوہ یارا

رات آجاتی ہے پل میں

کوئی کہتا ہے جبل میں

دور ہے اب بھی ستارا

کوہ یارا، کوہ یارا

***

کافی

کیا طنبور کہے

مٹّی کے اندھیاؤ اندر

کیا طنبور کہے

مٹّی، پانی کا سیارہ

گونج رہا اکتارا

کیا کیا نور کھے

مٹی کے اندھیاؤ اندر

کیا کیا نور کھے

دل اندر دریاؤ سائیں

آؤ سائیں

مٹّی کی تہہ داری اندر

کیاری اندر

زردزبور کھے

مٹّی کے اندھیاؤ اندر

کیا طنبور کھے!

***

کاندھے پہ دھرے ساز

گلیوں سے گزر جاؤں

کاندھے پہ دھرے ساز

سب لوگ ہمارے

اُس پار سدھارے

کاندھے پہ دھرے ساز

اُس شوخ نے اب تک

کھولے ہی نہیں دوار

یہ ابر یہ بوچھار

اس خواب میں ہم کو

چلنا ہے لگاتار

کاندھے پہ دھرے ساز

یہ شام سہانی

آنکھوں سے پرانی

مہران کے پانی

تجھ میں نہ اُتر جاؤں

کاندھے پہ دھرے ساز

***

سادھ بیلا

اپنی آنکھیں بند کر لو اور میرے ساتھ آؤ

ایک دریا، ایک کشتی

ایک کشتی، دو مسافر

دو مسافر، اک جزیرہ

اک جزیرہ اور چاروں سمت پانی

ـــــایک راجہ، ایک رانی

***

آدھے سیّارے پر

آدھا پیڑ خزاں کی زد میں جس پر پھول نہ پات

آدھے سیّارے پر سُورج، آدھے پر برسات

آدھے فوارے پر پانی اور آدھے میں ریت

سچے ہاتھ درانتی والے کاٹ رہے ہیں کھیت

اچھی فصل ہوئی ہے اب کے، مالک کا احسان

اس آنگن میں آؤ ساتھی مل کر کوٹیں دھان

ایک طرف پیتل کی گھنٹی، ایک طرف دیوار

اس اُجلی آواز کے رُخ پر کھولے رکھو دوار

خالی ہاتھ نہیں لوٹے گا اے میرے پاتال

کان کنوں کا ٹوکرا ہو یا ماہی گیر کا جال

***

پیتل کی گھنٹیاں

ہرے بھرے بن میں
چوپایوں کے ساتھ ہیں
پیتل کی گھنٹیاں

گرجا کی ڈور میں
مندر کی بھور میں
مکتب کے شور میں
سدا یونہی بجا کریں
پیتل کی گھنٹیاں

***

غیر حاضر زندگی کے سامنے

غیر حاضر زندگی کے سامنے
بارشوں میں جھومتے گاتے شجر
آندھیوں میں رقص فرماتے شجر

غیر حاضر زندگی کے سامنے

ایک سیارے کے جلنے کا سماں
آدمی کے بیچ نکلنے کا سماں

غیر حاضر زندگی کے سامنے

ایک محبوبہ کا جسمِ دلنواز
بجھتا جاتا صورتِ جاے نماز

***

نیلی بارش

نیلی بارش تیری آنکھوں میں
جیسے یہ منظر
پہلے بھی دیکھا ہو میں نے
آئینے کے دل میں یا پھر اس دروازے میں
جو کالی مٹّی کے پاتال میں کھلتا ہے

کالی مٹی کا پاتال ہمارا بچپن

بچپن اور جنّت کی چڑیاں

نیلی بارش میں سب کچھ بھیگ رہا ہے

بھیگے رنگوں سے تصویر بناؤں

تیرے بدن پر

میں نیلی بارش، تو کالی مٹی

تیرے ہونٹ دہک اُٹھے ہیں

جیسے شعلے

نیلی بارش کے آئینے میں جل اُٹھے ہوں

***

ایک پُل بنایا جا رہا ہے

میں اُن سے پوچھتا ہوں :

پُل کیسے بنایا جاتا ہے ؟

پُل بنانے والے کہتے ہیں :

تم نے کبھی محبت نہیں کی

میں کہتا ہوں : محبت کیا چیز ہے ؟

وہ اپنے اوزار رکھتے ہوئے کہتے ہیں :

محبت کا مطلب جاننا چاہتے ہو
تو پہلے دریا سے ملو —
روئے زمین پر دریا سے زیادہ محبت کرنے والا کوئی نہیں
دریا اپنے سمندر کی طرف بہتا رہتا ہے
یہ سپردگی ہے
سپردگی بچپن ہے اور بچپن بہشت —
لیکن بہشت تک پہنچنے کے لیے ایک جہنّم سے گزرنا پڑتا ہے
میں پوچھتا ہوں: جہنّم کیا ہے؟
وہ کہتے ہیں: اس سوال کا جواب درختوں کے پاس ہے
کوئی بھی موسم ہو، وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑتے
انھیں مٹی سے محبت ہے
انھیں پرندوں اور چیونٹیوں سے محبت ہے
جو ان کے جسم میں گھر بناتی ہیں
گھر کیا ہے؟ میں پوچھتا ہوں
وہ سب ہنسنے لگتے ہیں
پہلا مزدور کہتا ہے:
"اپنی عورت کی طرف جاؤ
ہر سوال کا جواب مل جائے گا"
***

پکاسو کے مسخرے

رنگے ہوئے چہرے، لمبوتری ٹوپیاں، بے ہنگم لباس
کبھی تار پر چلتے ہوئے
کبھی ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر
منھ سے رنگین کاغذ نکالتے ہوئے
کبھی سر کے بل
کبھی خوابوں کے بل
مگر خوابوں کے بل کہاں
خواب تو آدمی دیکھتا ہے
پکاسو کے مسخرے خواب نہیں دیکھتے
وہ تو صرف تماشائیوں کو دیکھ سکتے ہیں
تالیوں کے شور کو سُن سکتے ہیں
پکاسو کے مسخرے روٹی کو سوچ رہے ہیں
مگر نہیں، وہ تو صرف چابک کھا سکتے ہیں
رِنگ ماسٹر ان کا خدا ہے
جب تماشائی اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں
مسخرے اپنے خیمے میں واپس آجاتے ہیں

وہ اتنے تھک چکے ہوتے ہیں کہ انھیں نیند آجاتی ہے
انھیں خواب دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی
رنگے ہوے چہرے اور بے ہنگم لباس کے پیچھے
ایک آدمی ہے جو رونا چاہتا ہے
لڑنا چاہتا ہے
عورت کے ساتھ سونا چاہتا ہے
زندہ رہنا چاہتا ہے
مرنا چاہتا ہے
مگر رِنگ ماسٹر کے اشارے کے بغیر
—وہ مر بھی نہیں سکتے

***

اتنے بہت سے رنگ

سلاخوں سے اُدھر
کچھ درخت، ایک سڑک، کتّے کی زنجیر تھامے ایک آدمی
اور ایک ڈور، جس پر رنگ برنگے کپڑے سوکھ رہے ہیں
جسموں کے بغیر یہ کپڑے، بچوں کے بغیر یہ میدان
محبت کے بغیر یہ راستے

دنیا کتنی چھوٹی نظر آتی ہے
رنگ برنگے کپڑے سُوکھ جانے پر
ایک عورت آئے گی
تب ایک ایک کر کے یہ قمیصیں، پتلونیں اور فراکیں
اپنے اپنے جسم حاصل کر لیں گے
تب میدان بچوں سے
اور بچے خوشی سے بھر جائیں گے
یہ چھوٹی کائنات رنگوں سے بھر جائے گی
اتنے بہت سے رنگ
!اے عورت، اتنے بہت سے رنگ
***

بیت

سندھڑی تیرا دل، شاہ لطیف کا باغ
شاہ لطیف کا باغ، جیسے غیب کی بات
جیسے غیب کی بات مٹّی میں مستور
مٹّی میں مستور پانی کا اک پھول
پانی کا اک پھول شہزادے کے پاس

شہزادے کے پاس ایک عجیب طلسم
ایک عجیب طلسم شہزادے کا جسم
شہزادے کا جسم سب سے پہلا اِسم
***

گھوڑے کی موت

میں نے ایک گھوڑے کو مرتے ہوئے دیکھا
مرتے ہوئے گھوڑے نے کیا دیکھا:
تارکول کی سڑک ——
اُڑتا ہوا کاغذ یا ایک سکّہ جو بچے کے ہاتھ سے گر پڑا تھا
یا وہ جنگل جہاں پانی اور پرندوں کے ساتھ اس نے
آنکھ کھولی تھی
یا وہ دن جب پہلے آدمی نے اُسے دیکھا تھا

ایک گلے سڑے ڈھانچے پر بارش ہوگی
گھوڑا —— اک اور جنم لے گا
گاڑی بان کے دل میں
یا کسی نظم میں ——

***

زمیں کا آہنگ

زمیں کا آہنگ دھوپ، دریا، سفید گھوڑے کی ہنہناہٹ، غروب ہوتے ہوئے پرندے، گلاب کا آتشیں پیالہ، مجسّمے کا طویل سایہ، حکایتوں کے مہیب جنگل میں ڈھول گیتوں کا تازیانہ، علامتوں کا سیاہ پانی اُترنے والوں کی حیرتوں میں قدیم سورج کے پھول پتّے

***

خودکشی کا فرشتہ

نوحہ—سارا شگفتہ کے واسطے

انجن کے ماتھے کا سُورج، ایک بدن کے لاکھوں ٹکڑے، ہر ٹکڑے میں اک سیّارہ، سیارے کے دل میں سارا—میں بنجارا، ہاتھوں میں لے کر انگارا، مٹّی کے سینے میں اُترا، بیج میں سویا پھول میں جاگا
بن بیلے میں گونج رہا تھا سائیں مرنا کا اکتارا—

***

ایک افریقی حکایت

دن کے وسط میں ایک گھوڑا گاڑی تارکول کی سڑک پر ایک منزل کی جانب روانہ ہے۔ گاڑی بان کے داہنے ہاتھ میں چابک ہے۔ سورج سر پر ہے اور گھوڑا گاڑی کا سایہ تارکول کی سڑک پر۔ سڑک کے دونوں جانب لکڑی کے بنے ہوے مکانات ہیں۔ کہیں کہیں رسیوں پر رنگ برنگے کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ مکانوں کے پیچھے جنگل، اتنا جنگل کہ سورج کی روشنی زمین کا بوسہ نہیں لے سکتی۔ دن کے وسط میں گھوڑا چکرا کے گر پڑتا ہے۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ گاڑی بان گھوڑے کی لگام کو آزاد کرتا ہے اور چار دوسرے سیاہ فاموں کے ساتھ گھوڑے کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ گھوڑے کی آنکھوں میں بے چارگی کا آسمان ہے۔ پرندوں اور بادلوں سے خالی آسمان اور ایک تیز تپتا ہوا سورج۔ گاڑی بان چابک کی مدد سے گھوڑے کو اٹھانا چاہتا ہے لیکن کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔ ایک عورت مکان کی بالکنی سے یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ، پیچدار چوبی زینے کو طے کرتی ہوئی گرے ہوے گھوڑے تک پہنچتی ہے اور اس کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ گھوڑا فوراً کھڑا ہو جاتا ہے، گاڑی بان لگام کستا ہے اور منزل کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ عورت اپنی بالکنی پر واپس آجاتی ہے۔ اس کا مرد پوچھتا ہے: ''تم نے گھوڑے کے کان میں کیا کہا؟'' سیاہ فام عورت کہتی ہے: ''میں نے گھوڑے سے کہا: 'میں وہ ہوں جسے اپنے مرد سے پہلے کسی نے چھوا اور نہ ہی اُس کے بعد، اگر تو اس سچ پر یقین رکھتا ہے تو کھڑا ہو جا۔''

***

غزلیں

قندیلِ مہ و مہر کا افلاک پہ ہونا

کچھ اس سے زیادہ ہے مرا خاک پہ ہونا

***

قندیلِ مہ و مہر کا افلاک پہ ہونا
کچھ اس سے زیادہ ہے مرا خاک پہ ہونا

ہر صبح نکلنا کسی دیوارِ طرب سے
ہر شام کسی منزلِ غمناک پہ ہونا

یا ایک ستارے کا گزرنا کسی در سے
یا ایک پیالے کا کسی چاک پہ ہونا

لو دیتی ہے تصویر نہاں خانۂ دل میں
لازم نہیں اِس پھول کا پوشاک پہ ہونا

لے آئے گا اِک روز گل و برگ بھی ثروت
باراں کا مسلسل خس و خاشاک پہ ہونا

***

بادو باراں میں چلے یا تہہِ محراب رکھے
رکھنے والا مری شمعوں کو ابد تاب رکھے

کوئی موسم ہو مگر میرے خیاباں کے تئیں
نخلِ اندیشۂ فردا کو نمو یاب رکھے

وہ خدائے رم و رفتار سرِ ہر منزل
دلِ رہگیر کو آمادہ و بے تاب رکھے

ہے کوئی خاک نہادوں کو جگانے والا
اس سے پہلے کہ قدم تندیِ سیلاب رکھے

انہی گلیوں، انہی لوگوں سے ہوں بیزار مگر
پالنے والا انھیں خرم و شاداب رکھے
***

فراتِ فاصلہ و دجلۂ دُعا سے اُدھر
کوئی پکارتا ہے مجھے دشتِ نینوا سے اُدھر

کسی کی نیم نگاہی کا جل رہا ہے چراغ
نگار خانۂ آغاز و انتہا سے اُدھر

میں آگ دیکھتا تھا آگ سے جدا کر کے
بلا کا رنگ تھا رنگینیِ قبا سے اُدھر

میں راکھ ہو گیا طاؤسِ رنگ کو چھو کر
عجیب رقص تھا دیوارِ پیشِ پا سے اُدھر

زمین میرے لیے پھول لے کے آئی ہے
بساطِ معرکۂ صبر آزما سے اُدھر

یہ میرے ہونٹ سمندر کو چوم سکتے ہیں
حکایتِ شبِ افراد و آئنہ سے اُدھر
***

اُسی کنارۂ حیرت سرا کو جاتا ہوں
میں اِک سوار ہوں، کوہِ ندا کو جاتا ہوں

رمیدگی کا بیاباں ہے اور بے خور و خواب
غبار کرتا سکوت و صدا کو جاتا ہوں

قریب ہی کسی خیمے سے آگ پوچھتی ہے
کہ اس شکوہ سے کس قرطبہ کو جاتا ہوں

حذر کہ دجلۂ دشوار پر قدم رکھتا
شکار گاہِ فرات و فنا کو جاتا ہوں

کہاں گئے وہ خدایانِ درہم و دینار
کہ اک دفینۂ دشتِ بلا کو جاتا ہوں

سفارتِ حدِ حیرانگی پہ ہوں مامور
نگار خانۂ حسن و ادا کو جاتا ہوں

وہ دن بھی آئے کہ انکار کر سکوں ثروت
ابھی تو معبدِ حمد و ثنا کو جاتا ہوں
***

کتابِ سبز و درِ داستان بند کیے
وہ آنکھ سو گئی خوابوں کو ارجمند کیے

گزر گیا ہے وہ سیلابِ آتشِ امروز
بغیر خیمہ و خاشاک کو گزند کیے

بہت مصر تھے خدایانِ ثابت و سیّار
سو میں نے آئنہ و آسماں پسند کیے

اِسی جزیرۂ جائے نماز پر ثروت
زمانہ ہو گیا دستِ دعا بلند کیے
***

وصل کی شام گلستاں پھر اُسی شعلہ رو سے ہے
رنگِ ستون و سقف و بام آمدِ ہم سبو سے ہے

بہجتِ بے مثال میں ایک ملال کی جھلک
یا مری خامشی سے تھی یا تری گفتگو سے ہے

رزم گہِ وجود میں آنکھ جھپک نہیں سکی
یورشِ بادِ واپسیں مجھ پہ چہار سو سے ہے

موسمِ ابر و باد میں اور بھی کچھ چمک اُٹھا
سنگِ سفید جا بجا سُرخ مرے لہو سے ہے

جنبشِ برگِ بے خزاں، آمد و رفت کا سماں
وسعتِ ریگزار میں موجۂ آبجو سے ہے
***

گدائے شہرِ آئندہ تہی کاسہ ملے گا
تجاوز اور تنہائی کی حد پر کیا ملے گا

سیاہی پھیرتی جاتی ہیں راتیں بحر و بر پہ
انہی تاریکیوں سے مجھ کو بھی حصہ ملے گا

میں اپنی پیاس کے ہمراہ مشکیزہ اُٹھائے
کہ ان سیراب لوگوں میں کوئی پیاسا ملے گا

روایت ہے کہ آبائی مکانوں پر ستارہ
بہت روشن مگر نمناک وافسردہ ملے گا

شجر ہیں اور اس مٹی سے پیوستہ رہیں گے
جو ہم میں سے نہیں آسائشوں سے جا ملے گا

ردائے ریشمیں اوڑھے ہوئے گزرے گی مشعل
نشستِ سنگ پہ ہر صبح گلدستہ ملے گا

وہ آئینہ جسے عجلت میں چھوڑ آئے تھے ساتھی
نہ جانے باد و خاک آثار میں کیسا ملے گا

اسے بھی یاد رکھنا بادبانی ساعتوں میں
وہ سیّارہ کنارِ صبحِ فردا آ ملے گا

چراگاہوں میں رُک کر آسمانی گھنٹیوں کو
سنو کچھ دیر کہ وہ زمزمہ پیرا ملے گا

اُسی کی وادیوں میں طائرانِ رزق جُو کو
نشیمن اور اُجلی نیند کا دریا ملے گا

اِسی جائے نماز و رازپہ اک روز ثروت
اچانک در کھلے گا اور وہ جھونکا ملے گا
***

آنکھوں میں سوغات سمیٹے اپنے گھر آتے ہیں
بجرے لاگے بندر گاہ پہ سودا گر آتے ہیں

زرد زبور تلاوت کرتی ہے تصویر خزاں کی
عین بہار میں کیسے کیسے خواب نظر آتے ہیں

گندم اور گلابوں جیسے خواب شکستہ کرتے
دور دراز زمینوں والے شہر میں در آتے ہیں

شہزادی تجھے کون بتائے تیرے چراغ کدے تک
کتنی محرابیں پڑتی ہیں، کتنے در آتے ہیں

بندِ قبائے سُرخ کی منزل اُن پر سہل ہوئی ہے
جن ہاتھوں کو آگ چرا لینے کے ہنر آتے ہیں
***

گھر ہے تو کسی کو سونپتا جاؤں
جاتے ہوئے آگ کیوں لگا جاؤں

دیواروں کو ڈھال تھے مرے ہاتھ
جنگل ہے تو راستہ بنا جاؤں

بانہیں وہ شجر کہ روک لیں راہ
آنکھیں وہ بھنور کہ ڈوبتا جاؤں

نشّہ ہو کسی کی قربتوں کا
ایسا بھی نہیں کہ لڑکھڑا جاؤں

نفرت ہے تو منکشف بھی ہو گی
کچھ راز نہیں کہ جو چھپا جاؤں

جاتا ہوں خزاں کی سلطنت کو
تصویرِ بہار کھینچتا جاؤں
***

یہ ہونٹ ترے ریشم ایسے
کھلتے ہیں شگوفے کم ایسے

یہ باغ چراغ سی تنہائی
یہ ساتھ گل و شبنم ایسے

مری دھوپ میں آنے سے پہلے
کبھی دیکھے تھے موسم ایسے

کس فصل میں کب یکجا ہوں گے
سامان ہوئے ہیں بہم ایسے

سینے میں آگ جہنم سی
اور جھونکے باغِ اِرم ایسے
***

لہر لہر آوارگیوں کے ساتھ رہا
بادل تھا اور جل پریوں کے ساتھ رہا

کون تھا میں، یہ تو مجھ کو معلوم نہیں
پھولوں، پتوں اور دیوں کے ساتھ رہا

ملنا اور بچھڑ جانا کسی رستے پر
اک یہی قصہ آدمیوں کے ساتھ رہا

وہ اِک سورج صبح تلک مرے پہلو میں
اپنی سب ناراضگیوں کے ساتھ رہا

سب نے جانا بہت سبک، بے حد شفّاف
دریا تو آلودگیوں کے ساتھ رہا

میں اپنی جلاوطنی کے پچّیس برس
پنکھڑیوں اور تیتریوں کے ساتھ رہا
***

ہاتھ ہمارے بھی شامل تھے پربت کاٹنے والوں میں
دیکھو ہم نے راہ بنائی بے ترتیب سوالوں میں

رات اور دن کے الجھاؤ میں کون ہے وہ آہستہ خرام
جس کے رنگ ہیں دیواروں پر جس کی گونج خیالوں میں

دروازوں میں لوگ کھڑے تھے اور ہماری آنکھوں نے
پانی کا چہرہ دیکھا تھا مٹی کی تمثالوں میں

کُنجِ خزاں آثار میں ثروت آج یہ کس کی یاد آئی
ایک شعاعِ سبز اچانک تیر گئی پاتالوں میں
***

یہ جو پھوٹ بہا ہے دریا پھر نہیں ہو گا
روے زمیں پر منظر ایسا پھر نہیں ہو گا

زرد گلاب اور آئینوں کو چاہنے والی
ایسی دھوپ اور ایسا سویرا پھر نہیں ہو گا

گھایل پنچھی تیرے کنج میں آن گرا ہے
اس پنچھی کا دوسرا پھیرا پھر نہیں ہو گا

میں نے خود کو جمع کیا پچیس برس میں
یہ سامان تو مجھ سے یکجا پھر نہیں ہو گا

شہزادی ترے ماتھے پر یہ زخم رہے گا
لیکن اس کو چومنے والا پھر نہیں ہو گا

ثروت تم اپنے لوگوں سے یوں ملتے ہو
جیسے ان لوگوں سے ملنا پھر نہیں ہو گا

***

دشت لے جائے کہ گھر لے جائے
تیری آواز جدھر لے جائے

اب یہی سوچ رہی ہیں آنکھیں
کوئی تا حدِ نظر لے جائے

منزلیں بجھ گئیں چہروں کی طرح
اب جدھر راہ گزر لے جائے

تیری آشفتہ مزاجی، اے دِل
کیا خبر کون نگر لے جائے

سایۂ اَبر سے پوچھو ثروت
اپنے ہمراہ اگر لے جائے
***

ڈوبے تو ہلاک ہوے ہی نہیں
ایسے پیراک ہوے ہی نہیں

تری آنکھ کا کاجل بن تو گئے
ترے در کی خاک ہوے ہی نہیں

سورج نے آگ لگائی بہت
جنگل تو راکھ ہوے ہی نہیں

ہم پہروں بیٹھ کے رو بھی لیے
موسم نمناک ہوے ہی نہیں

اوپر تارے بھی کھلے ہوں گے
بادل تو چاک ہوے ہی نہیں
**

اب کس سے کہیں بھول گئے ہیں نگر اپنا
جنگل کے اندھیروں میں کٹتا ہے سفر اپنا

بدلیں جو ہوائیں تو پلٹ کر وہیں آئے
ڈھونڈا انہی شاخوں میں پرندوں نے گھر اپنا

پھولوں سے بھرے کنج تو اک خواب ہی ٹھہرے
یہ سایۂ دیوارِ خزاں ہے مگر اپنا

آنکھوں سے اُلجھنے لگے بیتے ہوے موسم
کیا نام لکھیں شہر کی دیوار پر اپنا

خاموش فصیلوں پہ ہُمکتی ہوئی بیلیں
دکھلا ہی دیا موسمِ گل نے اثر اپنا
***

ان اونچی سرخ فصیلوں کا دروازہ کس پر وا ہو گا
گھوڑے کی باگیں تھامے ہوے شہزادہ سوچ رہا ہو گا

دورویہ گلاب کے پودوں پر رنگوں کی بہار سجی ہو گی
پتھر کی کالی سیڑھیوں پر اک دیا ابھی جلتا ہو گا

مٹی کے منقّش پیالوں پر صدیوں کی گرد جمی ہو گی
اُڑ جانے والے پرندے کا پنجرہ کیسا لگتا ہو گا

اُڑتے بالوں کی اوٹ کیے، ہاتھوں میں زرد چراغ لیے
اسی ٹھنڈے فرش کے صحرا پر کوئی ننگے پیر چلا ہو گا

خاموش چراگاہوں کے لیے کوئی بادل ایسا گیت لکھوں
انھی دھوپ بھرے میدانوں میں کہیں بھیڑوں کا گلّہ ہو گا

***

پورے چاند کی سج دھج ہے شہزادوں والی
کیسی عجیب گھڑی ہے نیک ارادوں والی

بارش کی اُودی پَوروں کو چوم رہی ہے
ایک عمارت مٹی کی بنیادوں والی

نئ نئ سی آگ ہے یا پھر کون ہے وہ
پیلے پھولوں، گہرے سُرخ لبادوں والی

بھری رہیں یہ گلیاں پھول پرندوں سے
سجی رہے تاروں سے طاق مرادوں والی

تصویروں کے ٹکڑے جوڑتی رہتی ہے
اِک تمثیل فصیلوں اور فریادوں والی

آنکھیں ہیں اور دُھول بھرا سنّاٹا ہے
گزر گئی ہے عجب سواری یادوں والی

***

لڑکیاں، پھول، ساحلوں کے نگر
کشتیاں آلگیں کناروں پر

ہجر کی اک طویل رُت کے بعد
پھر وہی شام، پھر وہی منظر

آنکھ میں خواہشوں کے تیرتے رنگ
جھاگ میں جیسے مچھلیوں کے پر

بادبانوں میں چھپ کے بیٹھے ہیں
کچھ نئے خواب کچھ پرانے ڈر

بارشیں تو گزر گئیں ثروت
کن ہواؤں میں جھومتا ہے شجر
***

گر منتظرِ صدا نہ ہوتے

اس پل تو کہیں روانہ ہوتے

دیوارِ سکوں وداع کرتی
بادل ہمیں تازیانہ ہوتے

اندوہِ سفر میں ڈوب جاتے
دنیا کے تئیں فسانہ ہوتے

ہم خلوتیانِ آب و افلاک
کیا ہوتے اگر ندانہ ہوتے

مہجوریِ یک نفس کو دیکھو
ساعت سے کبھی زمانہ ہوتے

ثروت یہ درخت، یہ ستارے
مٹّی سے اگر رہا نہ ہوتے
***

بھٹکے گی ہوا صنوبروں میں

سب لوگ ہیں شام سے گھروں میں

سرما کی صدائیں گونجتی ہیں
پربت کے خموش منظروں میں

آباد رہے نگر تہہِ آب
اُترا نہ کوئی سمندروں میں

راتوں سے ڈری ہوئی زمیں کو
سورج نے چھپا لیا پروں میں

پہنائیِ شب گواہ رہنا
ہم بھی ہیں ترے شناوروں میں
***

خوابوں کی وہ رُت گزر گئی کیا
یہ رات بھی بے ثمر گئی کیا

رسم و رہِ صورت آشنائی

اس شہر سے کوچ کر گئی کیا

ہمراہ چلی تھی کوئی خوشبو
رستے میں کہیں ٹھہر گئی کیا

یہ کاہشِ روز و شب سلامت
وہ خواہشِ دربدر گئی کیا

ثروت یہ ہوائے موسمِ گل
تجھ کو بھی اُداس کر گئی کیا
***

سورج ابھی کہر میں چھپا تھا
جو نقش تھا دُور کی صدا تھا

روشن تھی ہوا کہیں کہیں پر
ایک آدھ کواڑ کھل چکا تھا

ویران سڑک پہ مردہ چڑیاں

موسم کا عجیب سانحہ تھا

تالاب تھا یا کہ شہر کے بیچ
آئینہ کسی نے رکھ دیا تھا

اوجھل تھا نگاہ سے جزیرہ
دیوارِ ہوا کا سامنا تھا

شاخوں میں ہوا رکی ہوئی تھی
رستہ دریا میں جا گرا تھا

لڑکی کوئی گھاٹ پر کھڑی تھی
پانی پہ چراغ جل رہا تھا

رقصاں کوئی عکس تھا نظر میں
لرزاں کوئی حرف جا بجا تھا

آنکھوں سے پرے تہہِ خس و خاک
خوشبو کا بدن سلگ رہا تھا

ثروت وہ فضائے صبحِ سرما
لگتا ہے کہ جیسے خواب سا تھا
***

دل گرفتہ کہ خوش گماں رہوں
انہی لوگوں کے درمیان رہوں

خاک افتادہ ہوں تو پھر کیوں کر
بے نیازِ غمِ جہان رہوں

جوئے کم آب ہو کہ سینۂ بحر
صورتِ عکسِ آسمان رہوں

دل میں رکھ لوں کوئی کرن ثروت
اور تا صبح میزبان رہوں
***

بدن کا بوجھ لیے، روح کا عذاب لیے

کدھر کو جاؤں طبیعت کا اضطراب لیے

یہی امید کہ شاید ہو کوئی چشم براہ
چراغِ دِل میں لیے، ہاتھ میں گلاب لیے

عجب نہیں کہ مری طرح یہ اکیلی رات
کسی کو ڈھونڈنے نکلی ہو ماہتاب لیے

سوا ہے شب کے اندھیروں سے دن کی تاریکی
گئے وہ دن جو نکلتے تھے آفتاب لیے

کسی کے شہر میں مانندِ برگِ آوارہ
پھرے ہیں کوچہ بہ کوچہ ہم اپنے خواب لیے

کہاں چلے ہو خیالوں کے شہر میں ثروت
گئے دنوں کی شکستہ سی یہ کتاب لیے
***

اک گیت میرے پاس ہوا سے پرانا ہے

اے بادلو، مجھے تو بہت دور جانا ہے

کھپریل کی چھتوں سے گزرتے ستارے کو
کچھ دیر آئنے میں ابھی جھلملانا ہے

کس سے ملو گے ٹوٹتی شاخوں کے درمیاں
یہ بارشوں کی رات بڑی وحشیانہ ہے

بوچھار میں سوار کو اوجھل بھی دیکھنا
یہ بن محبتوں سے بھرا بیکرانہ ہے

جنگل کہانیوں کی طرح پھیل جائیں گے
پل بھر سمے کی شاخ پہ منظر سہانا ہے
***

شہر زاد ہیں، گلیوں کی پہچان بھی رکھتے ہیں
اور بھٹکتے رہنے پر ایمان بھی رکھتے ہیں

رستہ رستہ اُگنے والے یہ ہم شکل درخت

دھوپ میں ہیں اور ہم جیسوں کا دھیان بھی رکھتے ہیں

دور افتادہ ویرانوں پر لہراتے بادل
اک دہلیز سے کچھ عہد و پیمان بھی رکھتے ہیں

اندیشوں میں جھلسنے والے دلوں کے یہ دالان
خوابوں اور خیالوں کو مہمان بھی رکھتے ہیں

رات کی رات چمکنے والے آسمان کے رنگ
دیواروں کو صدیوں تک حیران بھی رکھتے ہیں
***

ستارۂ صبح کی خبر لے، رِدائے افلاک پر نظر کر
حصارِ تاریک سے نکل کر کبھی رگِ تاک پر نظر کر

بہت سی باتیں ہیں جو ابھی تک حروف و اشکال سے وَرا ہیں
جہانِ اَسرار کے مسافر، سفالِ نمناک پر نظر کر

خزاں زدہ باغ کی حدوں پر کہانیاں سی گزر رہی ہیں

سلگتے پتّوں کی خامشی میں بہارِ خاشاک پر نظر کر

نگاہ کی آخری حدوں تک زوال کی شام بہہ رہی ہے
زمین کے ٹوٹتے کنارے، خروشِ بیباک پر نظر کر

وہ قصرِ شاہاں، وہ کج کلاہاں زمیں کا پیوند ہو چکے ہیں
یہ پرچمِ خاک اُسی جگہ ہے، گلیمِ صد چاک پر نظر کر
***

ٹوٹ چکا آسماں، ڈوب چلے گھر ترے
ایک دھواں دھار دن اور یہ منظر ترے

شعلگی و خیر گی، سیلِ سراسیمگی
ایک پرندہ مرا، سات سمندر ترے

حشمتِ آئینہ سے ہیبتِ افلاک تک
بول ستارے کہاں راکھ ہوئے پر ترے

گونجتی گلیوں میں ہے ان کے خیالوں کی چاپ

گشت و گلیم آشنا پاک پیمبر ترے

قلعہ کوہسار پر نوحہ نخلِ بلند
خود نگر و خود پسند سر و صنوبر ترے

شام شکستوں سے چُور، بے شجر و بے حضور
کون ہوائیں تھیں وہ، کیا ہوے لشکر ترے

سُن اے خدائے زبور، اب وہ ہجومِ طیور
کون نگر اڑ گئے چوم کے پتھر ترے
***

کوئی نشاں سرِ دیوار و بام اپنا نہیں
کسی نگر، کسی بن میں قیام اپنا نہیں

ہوا کے ساتھ ہوا، بارشوں میں بارش ہیں
کسی شجر کسی پتّے پہ نام اپنا نہیں

تلاش دل کو بیابانِ شامِ ہجراں کی

کہ ان ہواؤں میں خواب و خرام اپنا نہیں

کبھی کبھی کوئی بادل گزر ہی جاتا ہے
نہیں کہ سلسلۂ صبح و شام اپنا نہیں

بہت سے لوگ ہیں آشفتہ کار و خاک بسر
جہاں تلک ہے یہ صحرا تمام اپنا نہیں
***

منہدم ہوتی ہوئی آبادیوں میں فرصتِ یک خواب ہوتے
ہم بھی اپنے خشت زاروں کے لیے آسودگی کا باب ہوتے

شہرِ آزردہ فضا میں آبگینوں کو بروے کار لاتے
شام کی ان خانماں ویرانیوں میں صحبتِ احباب ہوتے

تازہ و نم ناک رکھتے آس اور امید کی سب کونپلوں کو
اور پھر ہمراہیِ بادِ شبانہ کے لیے مہتاب ہوتے

خود کلامی کے بھنور میں ڈوبتی پرچھائیں بن کر رہ گئے ہیں

اس اندھیری رات میں گھر سے نکلتے تو ستارہ یاب ہوتے

خاک آلودہ زمانوں پر برستیں جھومتی کالی گھٹائیں
موسموں کی آب و خاک آرائیوں سے آئنے سیراب ہوتے
***

نشیبِ حلقۂ صحنِ مکاں سے دور نہیں
کہیں بھی ہو وہ ستارہ یہاں سے دور نہیں

حدِ سپہر و بیاباں پہ جاگتی ہوئی لو
جو ہم سے دُور ہے، آئندگاں سے دور نہیں

گزرنے والی ہے گلیوں سے بادِ برگ آثار
کہ اب وہ صبح مری داستاں سے دور نہیں

اُسی کے حرفِ نگفتہ سے گونجتے در و بام
جو دور رہ کے بھی پہنائے جاں سے دور نہیں

میں اپنے حجرۂ تاریک تر میں رہ کر بھی

سرشتِ حلقۂ آوارگاں سے دور نہیں

مگر وہ شاخِ تہی رنگ وبستۂ دیوار
جو گلستاں سے الگ ہے خزاں سے دور نہیں
***

یہ جو اِک پرچھائیں سی ہے پیراہن میں کہیں
اِس بادل کو چھومت لینا پاگل پن میں کہیں

وہی نشیب اور وہی ستارہ، کون ہے تو ہمراہی
سارا جنگل بیت نہ جائے اس الجھن میں کہیں

جیسے کوئی خوش خبر پرندہ زمیں کنارے پر
آگ جلی ہے دور پہاڑی کے دامن میں کہیں

گیتوں سے کچھ خواب تھے جانے کس کے سپرد کیے
اسی شہر کی دیواروں میں یا پھر بن میں کہیں

دو آئینے ایک چراغ کی لو کو دہرانے میں

جلتے جائیں، پگھلتے جائیں تیز پون میں کہیں

***

آئے ہیں رنگ بحالی پر
رکھتا ہوں قدم ہریالی پر

اک سورج میری مٹھی میں
اک سورج ہل کی پھالی پر

وہی ایک چراغ دمکتا ہے
گندم کی بالی بالی پر

کھلتی ہے دھنک الغوزے کی
اُٹھتے ہیں قدم کھڑتالی پر

دل دکھتا ہے، دل روتا ہے
اک پتّے کی پامالی پر

کسی ان داتا سے گر جاتا

اک سکّہ کاسۂ خالی پر

کوئی نور ظہور کرے ثروت
اسی حمد الحمد کی جالی پر
***

آئینوں کے درمیاں سے گزرا
حیرت کدۂ جہاں سے گزرا

حسنِ رہِ زرد کی طلب تھی
آثارِ خس و خزاں سے گزرا

رہ گیرِ مراد کیا بتائے
کس دھن میں رہا، کہاں سے گزرا

ہو لیں گے اسی کے ساتھ ہم بھی
بادل جو کوئی یہاں سے گزرا

وہ پیش روِ بہار ثروت

شاید مرے خاکداں سے گزرا

***

سبز اندھیروں سا آنچل

گرم زمیں اور ٹھنڈا جل

ایک کٹورے میں کچھ آگ

ایک کٹورے میں بادل

اک سیّال اندھیرے میں

چلتا ہوں خوابوں کے بل

لذت کے معمورے میں

دور تلک کوئی آج نہ کل

تاریکی میں کلیاں چُن

سیّاروں کے ساتھ نہ چل

رتھ پہیوں میں ڈوب گئے

قرنوں تک پھیلے جنگل

اب یہ لوگوں پر موقوف
پھول اُگائیں یا حنظل

***

تنگ ہم آشفتگاں پر اب یہ پیراہن ہوا
پاؤں کی زنجیر شہروں کا مہذب پن ہوا

تو کوئی مہتاب جس پر عکس ہے خورشید کا
میں وہ پتھر ہوں کہ اپنی آگ سے روشن ہوا

میری ہمراہی کا جادو تھا کہ کیا تھا پر وہ شخص
اک کلی سے دیکھتے ہی دیکھتے گلشن ہوا

سبز اندر سبز راتوں میں سفر ہے دُور تک
سینۂ عشّاق گویا خواہشوں کا بن ہوا

بادیہ پیمائے حیرت کو اشارہ چاہیے

دھوپ کا آنچل ہوا یا ابر کا دامن ہوا

***

گردشِ سیّارگاں خوب ہے اپنی جگہ
اور یہ اپنا مکاں خوب ہے اپنی جگہ

اے دلِ آشفتہ سر، رات اندھیری ہے پر
رقص ترا شمع ساں خوب ہے اپنی جگہ

کاغذِ آتش زدہ، تیری حکایت ہی کیا
پھر بھی تماشائے جاں خوب ہے اپنی جگہ

ہجر نژادوں کا ہے ایک الگ ہی جہاں
اس سے نہ ملنا یہاں خوب ہے اپنی جگہ

سیرِ بیابان و در، عُقدہ کشائے ہنر
رنجِ مسافت میاں، خوب ہے اپنی جگہ

چہرۂ بلقیس پر آنکھ ٹھہرتی نہیں

صبحِ یمن کا سماں خوب ہے اپنی جگہ

***

مگراس سے آگے جو تاریک صحرا ہے وہ کون سا ہے
ابھی تو یہ منظر ہماری محبت سے دہکا ہوا ہے

بہت دیر تک اُس گھنیرے شجر نے پریشان رکھا
کسی شاخ پر آگ ہے اور کہیں ابر کا ذائقہ ہے

مجھے اپنا سیّارہ تبدیل کرنے کی خواہش ہی کیوں ہو
کہ اب بھی زمیں پر بڑا حسن ہے اور گمبھیرتا ہے

ہوائے خزاں میں درختوں کی دلجوئی لازم ہے ثروت
گریز اور گردش کا دن ہے مگر مجھ کو رُکنا پڑا ہے

***

گیتوں سے جب بھر جاتا ہوں، گانے لگتا ہوں
دیواروں سے اپنا سر ٹکرانے لگتا ہوں

کانٹوں کا ملبوس پہن کر آتا ہوں باہر
اور مٹی پر اپنے پھول بنانے لگتا ہوں

ساری رات بُنا کرتا ہوں ایک سنہرا جال
صبح کے ہوتے ہوتے جال بچھانے لگتا ہوں

اپنے ہی بچوں کی چیخیں کان میں آتی ہیں
جب بھی کسی بستی کو آگ لگانے لگتا ہوں

وہ بھی تھک کر گر جاتی ہے میرے بازو پر
رفتہ رفتہ میں بھی ہوش میں آنے لگتا ہوں

پہلے اُس کے نام کو لکھ کر تکتا ہوں پہروں
پھر اس آگ سے اپنے زخم جلانے لگتا ہوں
***

چاند، آفاق، شجر، دیکھنے والے کے لیے
سبھی چیزیں ہیں مگر، دیکھنے والے کے لیے

ایک دیوار ہے تا حدِ نظر پھیلی ہوئی
اور دیوار میں در، دیکھنے والے کے لیے

کسی کھوئی ہوئی جنّت کا نشاں ہو جیسے
ایک طاؤس کا پر، دیکھنے والے کے لیے

وہ مرے جسم کی مٹّی میں نہاں ہے ثروت
بیج میں جیسے شجر، دیکھنے والے کے لیے
***

فضائے ثابت و سیّار میرے ساتھ چلتی ہے
میں چلتا ہوں تو یہ دیوار میرے ساتھ چلتی ہے

چراغِ سُرخ رُو کو گفتگو کرتے ہوے دیکھو
یہ ضو آمادۂ پیکار میرے ساتھ چلتی ہے

تنفس کا اُجالا کاٹتا جاتا ہے پتھر کو
جہاں بھی جاؤں یہ تلوار میرے ساتھ چلتی ہے

غروبِ مہر کی آبادیوں میں راستہ بن کر
وہ اِک بلقیسِ کم آثار میرے ساتھ چلتی ہے

کشادہ منظروں میں انکسار اچھا نہیں ثروت
ہوائے وادیِ پندار میرے ساتھ چلتی ہے
***

تھامی ہوئی ہے کاہکشاں اپنے ہاتھ سے
تعمیر کر رہا ہوں مکاں اپنے ہاتھ سے

آیا ہوں وہ زمین وو شجر ڈھونڈتا ہوا
کھینچی تھی اک لکیر جہاں اپنے ہاتھ سے

حُسنِ بہار مجھ کو مکمل نہیں لگا
میں نے تراش لی ہے خزاں اپنے ہاتھ سے

آئینے کا حضور سمندر لگا مجھے
کاٹا ہے میں نے سیلِ گراں اپنے ہاتھ سے

ثروت ہدف بہت ہیں جوانانِ شہر میں
رکھوا بھی نہ تیر و کماں اپنے ہاتھ سے
***

جھلسے ہوئے تانبے کی طرح ہے مرا چہرا
اندر سے مگر جلد کا ہے رنگ سنہرا

کیوں آگ کے شہباز کو اُڑنے نہیں دیتے
کیوں روح کے چو گرد بٹھا رکھا ہے پہرا

تہوار ہیں جسموں سے اُدھر اور طرح کے
نہ عید، نہ میلاد، نہ ہولی، نہ دسہرا

مٹی پہ نمودار ہیں پانی کے ذخیرے
ان میں کوئی عورت سے زیادہ نہیں گہرا

ثروت سرِ میدان اُتر آنے سے پہلے
دیوار کو مہمیز دے، پرچم کو تو لہرا
***

آئینہ عکسِ رُخِ یار کے آجانے سے
دمک اُٹھا ہے گرفتار کے آجانے سے

یک بہ یک کیسے بدلنے لگے منظر دیکھو
اک ذرا گرمیِ رفتار کے آجانے سے

وہی محفل ہے مگر ہو گئی کیسی بے رنگ
بیچ میں حرفِ دل آزار کے آجانے سے

کہاں رُکتی ہے مری جان مہک پھولوں کی
راستے میں کسی دیوار کے آجانے سے

ایک بر آمدۂ شب میں بھڑکتی مشعل
بھیگنے لگتی ہے بوچھار کے آجانے سے
***

نقش کچھ ابھارے ہیں فرشِ خاک پر میں نے
نہر اک نکالی ہے وقت کاٹ کر میں نے

اُس درخت کے بازو دیر سے کشادہ تھے
توڑ ہی لیا آخر ایک برگِ تر میں نے

چیخ اک مسرّت کی خون میں سُنائی دی
جب شکار کو دیکھا تیر کھینچ کر ہیں نے

میری دسترس میں ہے آسمان مٹی کا
اِک لکیر کھینچی ہے دیکھ ہم شجر میں نے

جل اُٹھا اندھیرے میں انبساط کا پتھر
جب زمین کو دیکھا اُس کو دیکھ کر میں نے

میری گفتگو ثروت خواب گاہِ جنّت ہے
خواب ہی تو دیکھا ہے خواب سے اُدھر میں نے
***

پہاڑ کاٹتے ہیں، جوے شیر کھینچتے ہیں
زمینِ خاک پہ ہم بھی لکیر کھینچتے ہیں

بس ایک لذّتِ بے نام کے ستائے ہوے
عذابِ دربدری راہ گیر کھینچتے ہیں

زیادہ دیر ہواؤں میں رہ نہیں سکتے
ہمیں مکانِ ازل کے اسیر کھینچتے ہیں

پلک جھپک نہ سکی کارزارِ ہستی میں
کمان دار اشارے پہ تیر کھینچتے ہیں

بس ایک اس کا ہی چہرہ نہ بن سکا ثروت
وگرنہ عکس تو ہم دل پذیر کھینچتے ہیں
***

رفتہ رفتہ اک ہجومِ کہکشاں بنتا گیا
آسماں پر اور ہی اک آسماں بنتا گیا

چھوٹے چھوٹے لوگ تھے اور چھوٹی چھوٹی خواہشیں
سو میں ان کے درمیاں اک داستاں بنتا گیا

میری سیرابی کے قصے شہر کی گلیوں میں تھے
میری محرومی کا سایہ جاوداں بنتا گیا

پھول اتنے تھے کہ میرے ہاتھ چھوٹے پڑ گئے
کاروبارِ عشق کارِ گلستاں بنتا گیا

آگ کے نزدیک آجانا بہت آسان تھا
پھر مرا قربِ مسلسل امتحاں بنتا گیا
***

اچھا سا کوئی سپنا دیکھو اور مجھے دیکھو
جاگو تو آئینہ دیکھو اور مجھے دیکھو

سوچو یہ خاموش مسافر کیوں افسردہ ہے
جب بھی تم دروازہ دیکھو اور مجھے دیکھو

صبح کے ٹھنڈے فرش پہ گونجا اس کا ایک سخن
کرنوں کا گلدستہ دیکھو اور مجھے دیکھو

بازو ہیں یا دو پتواریں ناؤ پہ رکھی ہیں
لہریں لیتا دریا دیکھو اور مجھے دیکھو

دو ہی چیزیں اس دھرتی پہ دیکھنے والی ہیں
مٹّی کی سندرتا دیکھو اور مجھے دیکھو
***

وہ میرے سامنے ملبوس کیا بدلنے لگا
نگار خانۂ ابر و ہوا بدلنے لگا

تہہِ زمین کسی اژدہے نے جنبش کی
بساطِ خاک پہ منظر مرا بدلنے لگا

یہ کون اترا پئے گشت اپنی مسند سے
اور انتظامِ مکان و سرا بدلنے لگا

ہوا ہے کون نمودار تین سمتوں سے
کہ اندروں کا جزیرہ نما بدلنے لگا

یہ کیسے دن ہیں ہماری زمین پر ثروت
گُلوں کا رنگ، نمک کا مزا بدلنے لگا
***

گھر سے نکلا تو ملاقات ہوئی پانی سے
کہاں ملتی ہے خوشی اتنی فراوانی سے

خوش لباسی ہے بڑی چیز مگر کیا کیجے
کام اس پل ہے ترے جسم کی عریانی سے

سامنے اور ہی دیوار و شجر پاتا ہوں
جاگ اٹھتا ہوں اگر خوابِ جہانبانی سے

عمر کا کوہِ گراں اور شب و روز مرے
یہ وہ پتھر ہے جو کٹتا نہیں آسانی سے

شام تھی اور شفق پھوٹ رہی تھی ثروت
ایک رقاصہ کی جلتی ہوئی پیشانی سے

***

پہنائے بر و بحر کے محشر سے نکل کر
دیکھوں کبھی موجود و میسر سے نکل کر

آئے کوئی طوفان، گزر جائے کوئی سیل
اک شعلۂ بیتاب ہوں پتھر سے نکل کر

آنکھوں میں دمک اٹھی ہے تصویرِ در و بام
یہ کون گیا میرے برابر سے نکل کر

تا دیر رہا ذائقۂ مرگ لبوں پر
اک نیند کے ٹوٹے ہوئے منظر سے نکل کر

ہر رنگ میں اثباتِ سفر چاہیے ثروت
مٹّی پہ دھرو پاؤں سمندر سے نکل کر

***

سفینہ رکھتا ہوں، درکار اک سمندر ہے

ہوائیں کہتی ہیں اُس پار اک سمندر ہے

میں ایک لہر ہوں اپنے مکان میں اور پھر
ہجومِ کوچہ و بازار اک سمندر ہے

یہ میرا دل ہے مرا آئنہ ہے شہزادی
اور آئنے میں گرفتار اک سمندر ہے

کہاں وہ پیرہنِ سرخ اور کہاں وہ بدن
کہ عکسِ ماہ سے بیدار اک سمندر ہے

یہ انتہائے مسرّت کا شہر ہے ثروت
یہاں تو ہر در و دیوار اک سمندر ہے
***

ہوا و ابر کو آسودۂ مفہوم کر دیکھوں
شروعِ فصلِ گل ہے، ان لبوں کو چوم کر دیکھوں

کہاں، کس آئنے میں کون سا چہرہ دمکتا ہے

ذرا حیرت سرائے آب و گل میں گھوم کر دیکھوں

مرے سینے میں دل ہے یا کوئی شہزادۂ خود سر
کسی دن اس کو تاج و تخت سے محروم کر دیکھوں

گزر گاہیں جہاں پر ختم ہوتی ہیں وہاں کیا ہے
کوئی رہرو پلٹ کر آئے تو معلوم کر دیکھوں

بہت دن دشت و در میں خاک اڑاتے ہو گئے ثروت
اب اپنے صحن میں اپنی فضا میں جھوم کر دیکھوں
***

پتھروں میں آئنہ موجود ہے
یعنی مجھ میں دوسرا موجود ہے

زمزمہ پیرا کوئی تو ہے یہاں
صحنِ گلشن میں ہوا موجود ہے

خواب ہو کر رہ گیا اپنے لیے

جاگ اٹھنے کی سزا موجود ہے

اک سمندر ہے دلِ عشّاق میں
جس میں ہر موجِ بلا موجود ہے

آسمانی گھنٹیوں کے شور میں
اس بدن کی ہر صدا موجود ہے

میں کتابِ خاک کھولوں تو کھلے
کیا نہیں موجود کیا موجود ہے

جنّتِ ارضی بلاتی ہے تمھیں
آؤ ثروت راستہ موجود ہے
***

لال لہو فوارہ ہُو
یار نے خنجر مارا ہُو

ہو یا میں آوارہ ہُو

کل عالم بنجارا ہُو

شام کا پہلا تارا ہُو
من اندر دو بارا ہُو

چنبے دا اجیارا ہُو
بدّل دا اندھیارا ہُو

یار مرے نے آتش لائی
من اندر لشکارا ہُو

پیر کھڑاؤں تپتی چھاؤں
ہتھ وچ ہن اِکتارا ہُو

شور قدیمی چھمٹے دا
بول پیا اکتارا ہُو

ورقے نور کتاباں والے
مٹی دا سی پارا ہُو

سچا سائیں منارے والا
تن من تجھ پہ وارا ہُو

ست رنگا باغیچہ ثروت
نیل فلک مہ پارہ ہُو

***

رات باغیچے پہ تھی اور روشنی پتھر میں تھی
اک صحیفے کی تلاوت ذہنِ پیغمبر میں تھی

آدمی کی بند مٹھی میں ستارہ تھا کوئی
ایک جادوئی کہانی صبح کے منتر میں تھی

ایک رخشِ سنگ تھا آتش کدے کے سامنے
ایک نیلی موم بتّی دستِ آہن گر میں تھی

بیچ میں سوئی ہوئی تھی آتشِ آئندگاں
ایک پیراہن کی ٹھنڈک دھوپ کی چادر میں تھی

پاؤں ساکت ہو گئے ثروت کسی کو دیکھ کر
اک کشش ماہتاب جیسی چہرۂ دلبر میں تھی
***

(نذرِ غالب)

دیکھا جو اس طرف تو بدن پر نظر گئی
اک آگ تھی جو میرے پیالے میں بھر گئی

اُن راستوں پہ نام و نسب کا نشاں نہ تھا
ہنگامۂ بہار میں خلقت جدھر گئی

اک داستان اب بھی سناتے ہیں فرش و بام
وہ کون تھی جو رقص کے عالم میں مر گئی

اتنا قریب پا کے اسے دم بخود تھا میں
ایسا لگا، زمین کی گردش ٹھہر گئی

اک چیخ تیغِ تیز کی میرے لہو سے پھر

سنگِ سیاہ و سُرخ کے اندر اتر گئی

***

(نذرِ غالب)

ابتداے فصلِ گل ہے اور حصارِ نغمہ ہے
آتشِ آئندگاں کو انتظارِ نغمہ ہے

کنجِ آشفتہ سری میں رنگِ لالہ کے تئیں
لرزشِ دستِ حنائی انتشارِ نغمہ ہے

طائرانِ سرخ سے اک بات کہنی ہے مجھے
اب کہاں، کس جا پہ وہ پروردگارِ نغمہ ہے

منتظر بیٹھا ہوں بچپن کے پرندے کے لیے
دو گلابوں سے اُدھر اک جوئبارِ نغمہ ہے

زمزمہ پیرا ہے شاعر اور صحرا کے یہ پھول
دور تک ان وادیوں میں اعتبارِ نغمہ ہے

***

(نذرِ غالب)

کبھی گلاب کبھی بام و در کو دیکھتے ہیں
ہم آئنے میں کسی اور گھر کو دیکھتے ہیں

بہشتِ باغ میں بچپن کا اک پرندہ ہے
سو اس پرند، اسی ہم شجر کو دیکھتے ہیں

طیورِ سبز کو پیغام ایک دینا ہے
سو اس امید پہ گلہائے تر کو دیکھتے ہیں

یہاں پہ چشمِ مظاہر کا کوئی کام نہیں
ہم اپنے ہاتھ سے تیغ و سپر کو دیکھتے ہیں

دعائیں دو مرے قاتل کو اور درود پڑھو
"یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں"

اک آگ میرے پیالے میں بھر گئی ثروت
سو اس شراب سے روے سحر کو دیکھتے ہیں
***

بہشت اور بچپن

بیسویں صدی کی ٹوٹی پھوٹی ہوئی شعوری کیفیتوں کے درمیان جو ہمارے عصر کا سچا آئینہ ہے ہمارے عصر کی شاعری جنم لیتی ہے، مگر ان شعوری کیفیتوں میں لاشعور اور وجدان کی جھلکیاں زیادہ اور خود شعور کی کوششیں کم ہوتی ہیں۔ شاعر اپنے آپ سے بچھڑے ہوے ہیں۔ اسی طرح ہمارا آج کا شاعر ثروت حسین بھی اپنے فطری احساسات اور ان کے تجربوں سے اپنی روح کے دکھ سکھ لکھ کر اپنی روح پر فتح پاتا ہے۔ وہ اپنے خوبصورت لفظ وجدانی طور پر منتخب کرتا ہے۔ اس کے نغمے آنسوؤں سے نہیں اس کی روح سے جنم لیتے ہیں۔ اس کے ہاں وجود کے ہزار دروازے ہیں اور ہر دروازے میں آنکھیں، چہرے اور ستارے، بابل اور نینوا سے سفر کرتے ہوے اسپین اور چلی تک آتے ہیں۔ وہ پابلو نرودا کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، اہرامِ مصر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ وہ اپنے اندر پناہ گزیں بھی ہے اور کان کنوں کے ھی نہیں۔ وہ ملیر میں پیدا ہوا لیکن اس نے ابدیت میں آنکھیں ب ٹوکرے اور ماہی گیروں کے جال سے بے خبر کھولیں اور مستقبل کے سنہرے بیج ہاتھ میں لے کر اردو کی سرزمین پر آ گیا۔ وہ ایک اسلوب میں نہیں لکھتا، اس لیے کہ اس کے ساتھ قدیم داستانوں کے عناصر بھی ہیں اور وائی اور کافی کی سندھی اور پنجابی طرزیں بھی۔ ہاں نظمیں اضافت سے پاک ہیں مگر غزلوں پر فارسی زبان کی روشنی پڑتی رہتی ہے۔ آگ، درخت، کشتی، تلوار اور شہزادے تو اس کے ہاں علامت بن کے آتے ہی ہیں مگر اس کی پیدائش کا سیّارہ مریخ اور بُرج عقرب ہے۔ شاید اسی لیے اس کے یہاں سپاہی اور ملّاح دونوں نظر آتے ہیں۔ سپاہی نے شہزادے کا روپ دھار لیا ہے۔ اس کی روح ہیں ایک شہزادہ

چھپا ہوا ہے اور ایک درویش بھی۔ اُسے شاہ لطیف سے، بلّھے شاہ سے، سلطان باہو سے، میاں محمد سے عقیدت ہے۔
ی گروہ دریاے سندھ سے محبت کرتا ہے۔ سچ ہے وہ جنگلی بیر کی جھاڑیوں، شہتوت کے درختوں اور محبت کی ان
ملیر ہیں پیدا ہوا اور اسے بچپن ہی میں اپنی فوجی بیر ک، خار دار تار اور درختوں پر کھدے ہوے نام اچھے لگے۔ ملیر
ہیں پیدا ہونے والا یہ شاعر اپنی روح میں اسپین، تیونس اور بیت المقدس کی محبت رکھتا ہے اور اس کے باوجود قدیم
سنسکرت شاعر امارو سے اس کا پیار اٹوٹ ہے اور جنگل کی زندگی اس کے لیے بن باس نہیں، بلکہ شہر اس کے لیے بن
باس ہے۔ اس کا بنیادی احساس خوبصورتی اور بنیادی جذبہ خدمت ہے۔ اس کی شاعری کائنات کے نام ایک محبت
بھرا خط ہے۔ اس کائنات میں گھنٹیاں، آنسو اور سیّارے اور خوبصورت آنکھوں والی لڑکیاں اور سُرخ پنکھڑیوں والے
پھول ہیں۔ دودھیا منڈیر اور آسمانی پلوؤں پہ دھوپ اس دنیا میں جگمگاتی ہے۔ ثروت حسین لفظوں کے ایسے ایسے
نئے سمبندھ جانتا ہے جو اس کے ہم عصر کسی اور شاعر کی آنکھ پر روشن نہیں۔ اردو ادب کے آسمان پر ایک ستارہ اس
ُبلقیس اور صبحِ یمن کا سماں ایک ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ اپنی شاعری آبِ گہر ہ کے نام کا بھی روشن ہے۔ اس کے لیے چہ
سے لکھتا ہے۔ اس کے سخن میں مٹی کی خوشبو ہے اور محبوب کا بچپن، اور یہی اس کی شاعری کا آبِ حیات ہے۔ ہجر
ہو یا وصل، وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور جب ہم اس کی شاعری پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے، کبھی ہم سندھ کا صحرا ہیں
اور کبھی پاک پتن کا گلزار۔ اس کے ہاں جاے نماز آپ کو ملے گی اور دور دور تک یہ آواز آپ کے سامنے گونج رہی
ہو گی: ''اور جس جگہ سے تو نکلے منھ کر طرف مسجد الحرام کے اور یہی تحقیق ہے تیرے رب کی طرف سے اور اللہ
بے خبر نہیں تیرے کام سے اور جہاں سے تُو نکلے، منھ کر طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہُوا کرو منھ کرو اسی
کی طرف کہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کی جگہ —'' ثروت حسین کی شاعری خوبصورتی کی ایک سچی آواز
ز کی نقل اتارنی سیکھ لی ہے۔ ایسا وا ہے۔ یہ آواز اس زمانے میں بہت اہم ہو گئی ہے جب کوّوں نے سفید شاہین کی آ
لگتا ہے کہ ثروت حسین امید کی کشتی میں بیٹھے ہوے حیرت کے دریاؤں اور جنگلوں میں گھومتا رہتا ہے کہ یہی رومانی
شاعروں کی تقدیر ہے اور انھی کی طرح وہ محبت کے مقدّس مندر میں دیے جلاتا ہے۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ دیکھو میں

اپنے پر کھولتا ہوں اور محبت کے کھلے ہوئے آسمانوں میں اُڑتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں عالم محبوب کے دونوں ابروؤں کی طرح ہیں اور یہ کہ مجھے نماز میں تیرے ابرو محراب لگتے ہیں۔ اس کا مطلب نہیں کہ وہ صرف ایک صوفی اپنا ظہور کرتی ہے۔ اس کا کلام بیمار کے لیے ہسپتال کا THINGNESS شاعر ہے بلکہ اس کے ہاں چیزوں کی تکیہ اور نرس کا چہرہ بھی ہے اور اس کی شاعری میں کھڑکیاں، ننگے بدن، دھوپ اور روشنی بھی ہے۔ سفید دروازے پر ایک خوبصورت سی گھڑی لگی ہوئی ہے جس میں کبھی صبح ہوتی ہے کبھی رات اور کبھی دوپہر، اور وہیں اسپینی جنگ، ھنٹیاں، کالے جوتے، بڑھئی کا بکس، امریکہ کی آنکھیں، افریقہ کے جنگل، سفید سورج، گھاس گ اکتارا، پیتل کی ، پرندوں کا شور کالے بادل اور ہرے بھرے درخت۔ ایسا لگتا ہے بحیرۂ روم کی قوسِ قزح ثروت حسین کی شاعری میں نکلنا چاہتی ہے۔ خالی مقبرے اور سورج مکھی کے پھول، دونوں اس سے پیار کرتے ہیں اور جیسے جیسے ہم اس کی شاعری میں اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے لفظوں میں منظر سمٹ آتے ہیں اور وجود اپنا گھر بنالیتا ہے۔

قمر جمیل

خاکدان/کلیات ثروت حسین

ثروت حسین کا یہ دوسرا مجموعہ کلام، ادبی دنیا پر اپلوڈ کیا جارہا ہے۔ خاکدان نامی اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں دونوں موجود ہیں۔ غزلوں کا اسلوب نہایت الگ اور دلچسپ ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ غزلوں کو پڑھ کر شاعر کے

یہاں موجود کسی خاص قسم کے نظریے کو قائم کیا جائے، کیونکہ اکثر شاعر غزل کی دیرینہ اور پکی پکائی شعریات سے کام چلا کر خود کی ہی تردید اور تائید کرتا رہتا ہے اور مضمون آفرینی کے چکر میں کبھی ادھر کی ہانکتا ہے، کبھی ادھر کی لیکن ثروت کے یہاں ایسا نہیں ہے، ان کے یہاں دنیا کو سمجھنے، اسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش اور ایک قسم کا ذہنی اضطراب ان غزلوں میں ہر جگہ صاف دکھائی دیتا ہے اور کہیں کہیں یہ رجحان پوری غزل (مثلاً سب کے لیے کیوں نہیں) میں متواتر موجود رہتا ہے۔ نظمیں بھی کمال ہیں، خاص طور پر مجھے 'جہالت کا علم' اور 'منہ زور گھوڑے' س مجموعے کے مطالعے کا شوق اگر رکھتے ہوں، تو اسے پورا کیجیے اور ثروت حسین ابہت پسند آئیں۔ آیئے آپ بھی کے تعلق سے، اس کی شعری اور فکری بصیرت کے بارے میں اپنی اپنی رائے قائم کیجیے۔ یہ کلیات آج پبلیکیشنز سے شائع ہو چکی ہے، اور اسے خریدنے کے لیے آپ اجمل کمال سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ادبی دنیا پر یہ کتاب انہی کے شکریے کے ساتھ اپلوڈ کی جا رہی ہے۔ (تصنیف حیدر)

***

کبھی تیغِ تیز سپرد کی، کبھی تحفۂ گلِ تر دیا
کسی شاہزادی کے عشق نے مرا دل ستاروں سے بھر دیا

یہ جو روشنی ہے کلام میں کہ برس رہی ہے تمام میں
مجھے صبر نے یہ ثمر دیا، مجھے ضبط نے یہ ہنر دیا

زمیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، نیا شہر ایک بساؤں گا
میرے بخت نے مرے عہد نے مجھے اختیار اگر دیا

کسی زخمِ تازہ کی چاہ ہیں کہیں بھول بیٹھوں نہ راہ میں
کسی نوجواں کی نگاہ نے جو پیامِ وقتِ سفر دیا

مرے ساتھ بود و نبود ہیں جو دھڑک رہا ہے وجود میں
اسی دل نے ایک جہان کا مجھے روشناس تو کر دیا
***

اور دیوارِ چمن سے میں کہاں تک جاؤں گا
پھول تھامے ہاتھ میں اس کے مکاں تک جاؤں گا

جل اٹھے گی تیرگی میں ایک ست رنگی دھنک
شاعری کا ہاتھ تھامے میں جہاں تک جاؤں گا

منتظر ہو گی مری، وہ آنکھ فوّارے کے پاس
دشت سے لوٹوں گا صحنِ گلستاں تک جاؤں گا

آئینے میں عکس اپنا دیکھنے کے واسطے
ایک دن اس چشمۂ آبِ رواں تک جاؤں گا

ظلمتوں کے دشت میں ایک مشعلِ خود سوز ہوں
روشنی پھیلاؤں گا ثروت جہاں تک جاؤں گا
***

جب شام ہوئی میں نے قدم گھر سے نکالا
ڈوبا ہوا خورشید سمندر سے نکالا

ہر چند کہ اس رہ میں تہی دست رہے ہم
سودائے محبت نہ مگر سر سے نکالا

جب چاند نمودار ہوا دورِ افق پر
ہم نے بھی پری زاد کو پتھر سے نکالا

دہکا تھا چمن اور دمِ صبح کسی نے
اک اور ہی مفہوم گلِ تر سے نکالا

اس مردِ شفق فام نے اک اسم پڑھا اور
شہزادی کو دیوار کے اندر سے نکالا

***

بھر جائیں گے جب زخم تو آؤں گا دوبارا
میں ہار گیا جنگ مگر دل نہیں ہارا

روشن ہے مری عمر کے تاریک چمن میں
اس کنجِ ملاقات میں جو وقت گزارا

اپنے لیے تجویز کی شمشیرِ برہنہ
اور اس کے لیے شاخ سے اک پھول اتارا

کچھ سیکھ لو لفظوں کو برتنے کا سلیقہ
اس شغل میں گزرا ہے بہت وقت ہمارا

لب کھولے پری زاد نے آہستہ سے ثروت
جوں گفتگو کرتا ہے ستارے سے ستارا

***

نخلِ امید پہ ہم صبر کا پھل دیکھیں گے

آج اگر دیکھ نہ پائیں گے تو کل دیکھیں گے

چشمِ نظارہ ملی ہے تو بہر صورت ہم
آدمِ خاک کو مصروفِ عمل دیکھیں گے

ورقِ زیست پہ لکھیں گے کہانی اپنی
نظمِ ہستی کو کسی روز بدل دیکھیں گے

ساتھ رکھیں گے اسے باغ کی تنہائی میں
اور فوّارے سے گرتا ہوا جل دیکھیں گے

مدتوں بعد کوئی زمزمہ پرداز ہوا
آج ہم لوگ طلسماتِ غزل دیکھیں گے

لوٹ کر کوئی جہاں سے نہیں آتا ثروت
انہی راہوں پہ کسی وقت نکل دیکھیں گے
***

ثوابت سے سیّار تک جائیں گے

زمانے کی رفتار تک جائیں گے

ذرا دیکھنا آدمی کے قدم
جہانوں کے اَسرار تک جائیں گے

نواحِ گلستاں میں خاموش رہ
یہ نالے گرفتار تک جائیں گے

جہاں کے جھمیلوں سے فرصت ملی
تو یارِ طرح دار تک جائیں گے

بندھے ہاتھ کھل جو گئے ساتھیو
تو شاخِ ثمر دار تک جائیں گے
***

مجھ کو یہ رنج کھائے جاتا ہے
باغ پتّے گرائے جاتا ہے

دیکھ رہ گیر اس بیاباں کا

دھوپ کے سائے سائے جاتا ہے

ہے مکان و سرا و جا خالی "1"
تو کہاں منھ اٹھائے جاتا ہے "1"

کوئی سمجھاؤ اس درندے کو
آدمی خوں بہائے جاتا ہے

شاعرِ بے دماغ مٹّی پر
بیل بوٹے بنائے جاتا ہے

زرد ہو جائے گی زمیں ثروت
کیوں ستارے گرائے جاتا ہے

1۔ میر
***

رات ڈھلنے کے بعد کیا ہو گا
دن نکلنے کے بعد کیا ہو گا

سوچتا ہوں کہ اس سے بچ نکلوں
بچ نکلنے کے بعد کیا ہو گا

خواب ٹوٹا تو گر پڑے تارے
آنکھ ملنے کے بعد کیا ہو گا

رقص میں ہو گی ایک پرچھائیں
دیپ جلنے کے بعد کیا ہو گا

دشت چھوڑا تو کیا ملا ثروت
گھر بدلنے کے بعد کیا ہو گا
***

سحر ہو گی تارے چلے جائیں گے
یہ ساتھی ہمارے چلے جائیں گے

کسی اجنبی سرزمیں کی طرف
کنارے کنارے چلے جائیں گے

سنو، شب گئے بھیڑ چھٹ جائے گی
یہ عشّاق سارے چلے جائیں گے

ترستی رہے گی زمیں دھوپ میں
سبھی اَبر پارے چلے جائیں گے

وہ آئے نہ آئے مگر دوستو
اسے ہم پکارے چلے جائیں گے

تو کیا ان اندھیرے مکانوں ہیں ہم
یونہی دن گزارے چلے جائیں گے
***

دریچے ہوادار تھے اِس جگہ
کبھی شہر و بازار تھے اِس جگہ

جہاں اڑ رہی ہے بیاباں کی ریت
گلستاں کے آثار تھے اِس جگہ

بتاتی ہے رنگت در و بام کی
زمیں پر شفق زار تھے اِس جگہ

کھڑا ہے جہاں سر جھکائے فلک
ستارے نمودار تھے اِس جگہ

مگن اپنے خوابوں کی تعبیر میں
کبھی لوگ بیدار تھے اِس جگہ

سمندر کو جاتے ہوے راستے
میانِ گل و خار تھے اِس جگہ

اُڑا لے گئی ان کو ثروت ہوا
گُلوں کے جو انبار تھے اس جگہ
***

پھر وہ برسات دھیان میں آئی
تب کہیں جان جان میں آئی

پھول پانی میں گر پڑے سارے
اچھی جنبش چٹان میں آئی

روشنی کا اتا پتا لینے
شبِ تیرہ جہان میں آئی

رقصِ سیّارگاں کی منزل بھی
سفرِ خاک دان میں آئی

آئینے سے نکل کے ایک پری
بازوؤں کی امان میں آئی

وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی ثروت
ایک دن گلستان میں آئی
***

میں جو گزرا سلام کرنے لگا
پیڑ مجھ سے کلام کرنے لگا

دیکھ اے نوجوان میں تجھ پر
اپنی چاہت تمام کرنے لگا

کیوں کسی شب چراغ کی خاطر
اپنی نیندیں حرام کرنے لگا

سوچتا ہوں دیارِ بے پروا
کیوں مرا احترام کرنے لگا

عمرِ یک روز کم نہیں ثروت
کیوں تلاشِ دوام کرنے لگا
***

اُسی انجمن کی طرف جاؤں گا
یہاں سے یمن کی طرف جاؤں گا

بیاباں سے رنجِ سفر کھینچتا
بہارِ چمن کی طرف جاؤں گا

زمیں پر سنان و سپر چھوڑ کر
ترے پیرہن کی طرف جاؤں گا

زمانہ ہوا اس کو دیکھے ہوے
کسی دن وطن کی طرف جاؤں گا

تلاشِ مسرت میں دیوانہ وار
میں کارِ سخن کی طرف جاؤں گا
***

وہ صبحِ مناجات کب آئے گی
یہ دولت مرے ہات کب آئے گی

بڑی دھوپ ہے پیڑ جلنے لگے
جزیرے میں برسات کب آئے گی

دھڑکتا ہوا دل یہ پوچھا کیا
وہ شامِ ملاقات کب آئے گی

مشقّت بھرا دن تو رخصت ہوا
مہکتی ہوئی رات کب آئے گی

چھپا کر رکھا ہے جسے دل کے بیچ
مرے لب پہ وہ بات کب آئے گی
***

(ساقی فاروقی کے لیے)

وہیں پر مرا سیم تن بھی تو ہے
اسی راستے میں وطن بھی تو ہے

بجھی روح کی پیاس لیکن سخی
مرے ساتھ میرا بدن بھی تو ہے

نہیں شامِ تیرہ سے مایوس میں
بیاباں کے پیچھے چمن بھی تو ہے

مشقّت بھرے دن کے آخیر پر
ستاروں بھری انجمن بھی تو ہے

مہکتی دہکتی لہکتی ہوئی
یہ تنہائی باغِ عدن بھی تو ہے
***

فلک سے گلستاں اُتر از میں پر
سلیماں نغمہ خواں اُتر از میں پر

پری زادوں نے جب وہ تخت رکھا
تو ست رنگا دھواں اُتر از میں پر

کنیزیں کہہ رہی تھیں، آؤ دیکھو
سفیرِ آسماں اُتر از میں پر

صحائف اور تحائف کے جلو میں
یمن کا میہماں اُتر از میں پر

فلک کے دشت سے حیران و ششدر
ہجومِ کہکشاں اُترا زمیں پر

کشش تھی آگ جیسی خاک داں میں
کہ وہ ابرِ رواں اترا زمیں پر

بیاباں میں مجھے بے چین پا کر
فرشتہ ناگہاں اُترا زمیں پر

ہوئی جب۔ صبح تو وہ شخص ثروتؔ
سنا کر داستاں اُترا زمیں پر
***

اک روز میں بھی باغِ عدن کو نکل گیا
توڑی جو شاخِ رنگ فشاں، ہاتھ جل گیا

دیوار و سقف و بام نئے لگ رہے ہیں سب
یہ شہر چند روز میں کتنا بدل گیا

میں سو رہا تھا اور مری خواب گاہ میں
اک اژدہا چراغ کی لو کو نگل گیا

بچپن کی نیند ٹوٹ گئی اس کی چاپ سے
میرے لبوں سے نغمۂ صبحِ ازل گیا

تنہائی کے الاؤ سے روشن ہوا مکاں
ثروت جو دل کا درد تھا نغموں میں ڈھل گیا
***

یک بہ یک تبدیل رنگِ آسماں کیسے ہوا
اس جگہ دیوارِ گلشن تھی، دھواں کیسے ہوا

شب سرائے آب و گل میں دیکھتے ہی دیکھتے
آدمِ خاکی اسیرِ امتحاں کیسے ہوا

چل رہی ہے دشت و در میں واقعی بادِ مراد
آج پھر وہ شوخ تجھ پر مہرباں کیسے ہوا

پوچھ ہی لیجے خروشِ شامِ ابر و باد سے
منہدم آخر یہ پتھر کا مکاں کیسے ہوا

ابتدائے فصلِ گل تھی اور وہ تھا بام پر
کیا کہیں اس کھیل میں دل کا زیاں کیسے ہوا
***

اک کام سونپتے ہیں میاں، کر سکو اگر
روشن چراغِ دل زدگاں کر سکو اگر

تصویرِ باغ و راغ بدل جائے دوستو
ان ٹہنیوں کو رنگ فشاں کر سکو اگر

مہکے ہمارا گھر بھی گلاب و سحاب سے
دو ایک دن قیام یہاں کر سکو اگر

وہ رنج جو کہ اور کسی سے کہے نہ ہوں
ہم سے بیان کر دو، بیاں کر سکو اگر

آئندگاں کو امن ملے، آشتی ملے
ثروت علاجِ شہرِ خزاں کر سکو اگر
***

رکھ لیتے ہیں دل بیچ، زباں پر نہیں لاتے
کچھ تیر ہیں ایسے جو کماں پر نہیں لاتے

ممکن ہی نہیں صبحِ بہاراں کا کھلے در
ایمان اگر شامِ خزاں پر نہیں لاتے

یادِ رخِ گل فام کو سینے میں چھپا رکھ
یہ جنس ہے نایاب، دکاں پر نہیں لاتے

کیا جانیے کس دھن میں گرفتار ہیں ثروت
مدّت سے وہ تشریف یہاں پر نہیں لاتے
***

دل کو محرومِ فغاں رکھیو مت
اپنے سینے میں دھواں رکھیو مت

موجۂ آبِ رواں کہتی ہے
مجھ پہ بنیادِ مکاں رکھیو مت

سخت ہے معرکۂ جنگ وجدل
ہاتھ سے تیر و کماں رکھیو مت

آگ سے کھیلنے والے ہیں بہت
ان کتابوں کو یہاں رکھیو مت

معبدِ زیست میں سنّاٹا ہے
اس کو محرومِ اذاں رکھیو مت
***

آیئنے کا سکوت سمندر لگا مجھے
جس سے کلام کرتے ہوئے ڈر لگا مجھے

کیا رات تھی وہ پچھلے دسمبر کی دوستو
جب چودھویں کا چاند گدا گر لگا مجھے

اترا چراغِ سبز لیے جب میں باغ میں
پھولوں کا رنگ پہلے سے بہتر لگا مجھے

اس جنگ جو نے نام بتایا نہیں مگر
چہرے کی تاب و تب سے سکندر لگا مجھے

جب میں گرا زمین پہ جھک آئیں ٹہنیاں
ثروت وہ نخلِ سبز، پیمبر لگا مجھے
***

کبھی بلقیس کبھی شہرِ سبا لگتی ہے
شاعری تختِ سلیماں سے سوا لگتی ہے

میں کسی اور ہی عالم کی خبر لاتا ہوں
چمنستاں میں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے

کس کو دیکھا ہے کہ اطراف کی ساری دنیا
آئینہ خانۂ انداز و ادا لگتی ہے

یورشِ وقت، اُجڑتے نہیں دیکھیں ہم نے
بستیاں جن کو فقیروں کی دعا لگتی ہے

ہمہ تن گوش ہوں مہمان سرا میں ثروت
ہر اک آہٹ مجھے آوازِ درا لگتی ہے
***

زمیں بھی ایک آیت، آسماں بھی ایک آیت ہے
مرے نزدیک یہ ابرِ رواں بھی ایک آیت ہے

نشانی ہے بدلتے موسموں میں اس کے ہونے کی
ہوائے تیز میں برگِ خزاں بھی ایک آیت ہے

خزاں کی دوپہر ہے اور بیٹھا سوچتا ہوں میں
مسلسل خاک ہوتا یہ مکاں بھی ایک آیت ہے

فضائے دم بخود میں سانس لیتا ہے کوئی ثروت
مجھے تو جھٹ پٹے کا یہ سماں بھی ایک آیت ہے

***

اس لمحہ موجود میں کیا ہے سوائے آب و گل
آدم کا رستہ دیکھتی حیرت سرائے آب و گل

پھولوں بھرا یہ راستہ، کس نے کیا آراستہ
اس باغ پر بھی اک نظر، نا آشنائے آب و گل!

یارب یہ کوئی خواب ہے یا خواب کی تعبیر ہے
انگور کی بیلوں تلے شعلے بجائے آب و گل

دامن زمیں کا تھام لے، تیشے سے اپنے کام لے
تیرے ہی اندر رو نما فرماں روائے آب و گل

طغیانِ حیرانی میں ہوں، اس کی ثنا خوانی میں ہوں
جس ہاتھ نے پہلے پہل رکھی بنائے آب و گل
***

راہ کے پیڑ بھی فریاد کیا کرتے ہیں

جانے والوں کو بہت یاد کیا کرتے ہیں

گرد جمتی چلی جاتی ہے سبھی چیزوں پر
گھر کی تزئین تو افراد کیا کرتے ہیں

کام ہی کیا ہے تیرے زمزمہ پردازوں کو
باغ میں مدحتِ شمشاد کیا کرتے ہیں

پھول جھڑتے ہیں شفق فام ترے ہونٹوں سے
ایسی باتیں تو پری زاد کیا کرتے ہیں

ہم نے ثروت یہی جانا ہے گئے لوگوں سے
آدمی بستیاں آباد کیا کرتے ہیں
ؔ***

ہم چل دیے اور دوست ہمارا نہیں آیا
کشتی کے تعاقب میں کنارا نہیں آیا

پہنچا بڑے ارمان لیے دشتِ فلک تک

ہاتھوں میں مگر ایک بھی تارا نہیں آیا

!کیا سانحہ گزرا مرے رہ گیر پہ لوگو
کیوں خیر خبر کو وہ دوبارہ نہیں آیا

ہم لوٹ گئے جیسے پلٹتے ہیں پرندے
ہر چند کسی در کا اشارا نہیں آیا

جب آئے سفر سے تو رہِ عشق میں ثروت
وہ دشت وہ بستی وہ منارا نہیں آیا
***

فسونِ خاک، رنگِ آسماں حیرت میں رکھتا ہے
مجھے تو یہ در و بستِ جہاں حیرت میں رکھتا ہے

فرازِ کوہ پر آبِ زلال و یخ پیا میں نے
سرودِ چشمۂ آبِ رواں حیرت میں رکھتا ہے

کبھی بوندوں کی رم جھم روک لیتی ہے قدم میرے

کبھی دروازہ کھلنے کا سماں حیرت میں رکھتا ہے

شگوفے پھوٹتے ہیں پھول پھل آتے ہیں شاخوں پر
زمیں پر کاروبارِ گلستاں حیرت میں رکھتا ہے

عناصر کے مقابل اور زیرِ آسماں ثروت
کوئی تو ہے جو بہرِ امتحاں حیرت میں رکھتا ہے
***

غنچہ و گل کا شمار، سب کے لیے کیوں نہیں
دامنِ ابرِ بہار، سب کے لیے کیوں نہیں

چشمۂ آبِ صفا تیرے تصرف میں کیوں
اے مرے ناقہ سوار، سب کے لیے کیوں نہیں

باغ کی بنیاد میں سب کا لہو ہے تو پھر
ذائقۂ برگ و بار، سب کے لیے کیوں نہیں

چند گھرانوں تلک تیرے کرم کی جھلک

جنبشِ ابروے یار، سب کے لیے کیوں نہیں

تیری عنایت کے در مجھ پہ کھلے ہیں مگر
اے مرے پروردگار، سب کے لیے کیوں نہیں
***

دیکھی بھالی ہوئی ہر چیز یہاں لگتی ہے
دیکھنا یہ ہے، مری آنکھ کہاں لگتی ہے

زرد ملبوس پہن کر وہ چمن میں آئی
وہ بھی منجملۂ تصویرِ خزاں لگتی ہے

آ گئے خاک نہادوں کو جگانے والے
دیکھیے آگ سرِ کنجِ اماں لگتی ہے

سبزہ و گل کی زمیں اتنی پرانی ثروت
سینۂ خاک پہ چلیے تو جواں لگتی ہے
***

میری کشتی ٹوٹ رہی ہے، سر سے اونچا پانی ہے
پانی کاٹتے جیون بیتا، پھر بھی کتنا پانی ہے

تم بھی خوش ہو اپنے گھر میں اور میں اپنے سمندر میں
اپنی اپنی مٹی ہے اور اپنا اپنا پانی ہے

تم اک ندّی، تم اک دریا، اس سے آگے کیا ہو تم
جتنا تم نے سوچ رکھا ہے اس سے زیادہ پانی ہے

کھلا سمندر میرا گھر ہے، میری قبر بھی ہو تو کیا
بازوؤں جیسی لہریں ہیں اور آنکھوں جیسا پانی ہے

اتنی سچی، ایسی مکمل تنہائی کب دیکھی تھی
دور دور تک کوئی نہیں ہے، سورج ہے یا پانی ہے

جانے عمر کے کس حصے میں اس پر یہ احوال کھلے
اس کی کہانی مٹی ہے اور میرا قصہ پانی ہے

اک لڑکی کا چہرہ ثروت دل کی تہوں میں تیر گیا

ٹوٹتے بنتے ساحل ہیں اور جھاگ اڑاتا پانی ہے

***

قسم اس آگ اور پانی کی
موت اچھی ہے بس جوانی کی

اور بھی ہیں روایتیں لیکن
اک روایت ہے خوں فشانی کی

جسے انجام تم سمجھتی ہو
ابتدا ہے کسی کہانی کی

رنج کی ریت ہے کناروں پر
موج گزری تھی شادمانی کی

چوم لیں میری انگلیاں ثروت
اُس نے اتنی تو مہربانی کی

***

اے ہم چراغ آؤ، اے ہم صلیب آؤ
اس بھیڑ سے نکل کر میرے قریب آؤ

کانٹوں کا تاج لے کر، میرا خراج لے کر
اے بد نصیب آؤ، اے خوش نصیب آؤ

کوزے میں خون دیکھو، میرا جنون دیکھو
صبحِ کفن سے پہلے میرے حبیب آؤ

پھر اس کے بعد تم کو اک خواب میں ملوں گا
نغموں کا طشت لے کر اے عندلیب آؤ

اس آخری سخن سے سلگاؤ اپنے پتھر
دیکھو وہ ڈھل رہی ہے شامِ مہیب، آؤ

***

یک بہ یک منظرِ ہستی کا نیا ہو جانا
دھوپ میں سرمئی مٹی کا ہرا ہو جانا

صبح کے شہر میں اک شور ہے شادابی کا
گلِ دیوار ذرا بوسہ نما ہو جانا

کوئی اقلیم نہیں میرے تصرّف میں مگر
مجھ کو آتا ہے بہت فرماں روا ہو جانا

زِشت اور خوب کے مابین جلایا میں نے
جس گلِ سرخ کو تھا شعلہ نما ہو جانا

چشم کا آئنہ خانے میں پہنچنا ثروت
دلِ درویش کا مائل بہ دعا ہو جانا
***

خواب اچھے نہیں اس عمر میں گھر کے لوگو
یہی دن رات تو ہوتے ہیں سفر کے لوگو

جامنی رنگ کا شعلہ کوئی لہراتا ہے
ہم تو اس آگ کو دیکھیں گے ٹھہر کے لوگو

یہی مٹی جو کنارے پہ نظر آتی ہے
اور ہو جاتی ہے پانی میں اُتر کے لوگو

اپنے ہی شہر کا احوال سنا کرتے ہیں
جیسے قصے ہوں کسی اور نگر کے لوگو

آج ثروت سے ملاقات ہوئی تھی اپنی
یہاں چرچے ہیں اسی آئنہ گر کے لوگو

***

زمین ڈولتی ہے، آسماں گزرتا ہے
چراغ جلتے ہی کیا کیا گماں گزرتا ہے

یہ آگ دور کسی دشت میں لگی ہے مگر
ہمارے شہر سے ہو کر دھواں گزرتا ہے

میں سن رہا ہوں شگفتِ بہارِ آئندہ
اگرچہ لشکرِ بادِ خزاں گزرتا ہے

***

اے شجرِ غنودگی، نیند مجھے بھی آ نہ جائے
میرے غیاب میں کہیں دھوپ وہ جگمگا نہ جائے

مزرع وماہ کے اسیر، دیکھ یہ سُرمئی لکیر
صورتوں کو مٹا نہ دے، آئینوں کو بجھا نہ جائے

سب یہ ستارہ و سبو، سلسلہ ہائے کاخ و کُو
بارِ تجلیات سے خاک میں ہی سما نہ جائے

اے نگہِ نشانہ جو، آج ہوں اپنے روبرو
وار کوئی غلط نہ ہو، تیر کوئی خطا نہ جائے

خلوتیانِ ذی شرف، شور بہت ہے ہر طرف
لفظ کوئی نہ کہہ سکیں، حرف کوئی سنا نہ جائے
***

پتھروں میں آئنہ موجود ہے
یعنی مجھ میں دوسرا موجود ہے

زمزمہ پیرا کوئی تو ہے یہاں
صحنِ گلشن میں ہوا موجود ہے

خواب ہو کر رہ گیا اپنے لیے
جاگ اٹھنے کی سزا موجود ہے

اک سمندر ہے دلِ عشّاق میں
جس میں ہر موجِ بلا موجود ہے

آسمانی گھنٹیوں کے شور میں
اس بدن کی ہر صدا موجود ہے

میں کتابِ خاک کھولوں تو کھلے
کیا نہیں موجود، کیا موجود ہے

جنتِ ارضی بلاتی ہے تمھیں
آؤ ثروت راستا موجود ہے

***

آگ میں یا آب میں رہتی ہو تم
صوفیہ، کس خواب میں رہتی ہو تم

شیرنی رہتی نہیں دیوار میں
کس لیے آداب میں رہتی ہو تم

ایک سیارے نے آکر دی خبر
حجلۂ مہتاب میں رہتی ہو تم

آتشِ سیال میں جلتا ہوں میں
پارۂ سیماب میں رہتی ہو تم

گوشۂ نایاب میرا مستقر
عرصۂ کم یاب میں رہتی ہو تم

ساتواں دریاب ہے ثروت حسین
جانے کس پنجاب میں رہتی ہو تم
***

صبح کے شور میں، ناموں کی فراوانی میں
عشق کرتا ہوں اسی بے سر و سامانی میں

سُورما جس کے کناروں سے پلٹ جاتے ہیں
میں نے کشتی کو اتارا ہے اسی پانی میں

صوفیہ، تم سے ملاقات کروں گا اک روز
کسی سیّارے کی جلتی ہوئی عریانی میں

میں نے انگور کی بیلوں میں تجھے چوم لیا
کر دیا اور اضافہ تری حیرانی میں

کتنا پُر شور ہے جسموں کا اندھیرا ثروت
گفتگو ختم ہوئی جاتی ہے جولانی میں

***

جھوم رہی زندگی، ناچ رہی ہے اجل
سن تو سہی صوفیہ، آج ہوا میں نکل

ایک چمکتی سویرا اور درختوں کے ڈھیر
دن کی چکاچوند میں میری کلہاڑی کا پھل

دھوپ بہت تیز ہے، حوصلہ انگیز ہے
دیکھ مری شیرنی، آج مرے ساتھ چل

چھوڑ یہ گل پیرہن، چوم لے میرا بدن
اس کے سوا کچھ نہیں تیری اداسی کا حل

میری تگ و تاز پر عرصۂ آفاق تنگ
کانپ رہا ہے فلک، گونج رہے ہیں جبل
***

ساحل کی خاموش چٹانیں یا پھر گونج سمندر کی
وصل و فراق کی حد پر میں نے بود و باش مقرر کی

رات گئے کیا پھول کھلا تھا بیچ ہمارے آنگن کے
یوں اُترے افلاک سے تارے جیسے فوج سکندر کی

گزر گیا گلدستہ تھامے ہاتھ کسی شہزادی کا
شام سے کھینچ رہی ہے دنیا آئینے کے اندر کی

جتنے تراشیدہ پیکر تھے ابراہیم نے توڑ دیے
ثروت اس بت خانۂ شب میں آنکھ لگی جو آذر کی

***

کھینچے ہیں رنج، شہر کے حق میں دعا بھی کی
ہم وہ ہیں ہم نے رسمِ پیمبر ادا بھی کی

نکلیں گے گھر سے سیرِ زمانہ کے واسطے
ہے شرط، زندگی نے ہماری وفا بھی کی

کھینچی لکیر خون سے زنداں کے فرش پر
اپنے لیے جنوں کی مقرر سزا بھی کی

دل چاہتا نہیں، در و دیوار چھوڑیے
اس نے ہزار پاؤں کی زنجیر وا بھی کی

***

کس کنارے لگے گا آخر کار
یہ جہانِ ثوابت و سیار

سو رہا تھا کسی شبستاں میں
گر پڑی مجھ پہ رنگ کی دیوار

چل پڑی پھر ہوا خزاؤں کی
زرد پتوں کے لگ گئے انبار

آئنہ آئنے کا دشمن ہے
آدمی سے ہے آدمی بیزار

آ گئی رُت بہار کی ثروت
کھل اٹھے رنگ، جاگ اٹھی رفتار

***

وہ رازداں، وہ دوست ہمارے چلے گئے

سن کر اذانِ فجر، ستارے چلے گئے

چپ سادھ لی گرفتہ دلوں نے نگر کے بیچ
شہرِ ستم میں وقت گزارے چلے گئے

ہم کو نہ روک پائی تری بے توجہی
دیوانگی میں تجھ کو پکارے چلے گئے

تا وہ بھی جشنِ فتح منائے زمین پر
ہم جنگ جان بوجھ کے ہارے چلے گئے
***

جانے اس نے کیا دیکھا شہر کے منارے میں
پھر سے ہو گیا شامل زندگی کے دھارے میں

اسم بھول بیٹھے ہم، جسم بھول بیٹھے ہم
وہ مجھے ملی یارو رات اک ستارے میں

اپنے اپنے گھر جا کر سکھ کی نیند سو جائیں

تو نہیں خسارے میں، میں نہیں خسارے میں

میں نے دس برس پہلے جس کا نام رکھا تھا
کام کر رہی ہو گی جانے کس ادارے میں

موت کے درندے ہیں اک کشش تو ہے ثروت
لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خود کشی کے بارے میں
***

کچھ اکتساب کیا ہے گلاب سے میں نے
لیا ہے کام خیال اور خواب سے میں نے

بہارِ لالہ و نسرین دیکھنے کے لیے
قدم نکالا جہانِ خراب سے میں نے

نگار خانۂ ہستی عجیب مستی ہے
کہ ہاتھ کھینچ لیا ہے شراب سے میں نے

یہ بست و بندِ مسرت مجھے پسند آیا

چنا ہے پھول ردائے چناب سے میں نے

خدا گواہ کہ اک اور آب کی خاطر
بچا لیا ہے مکاں سیلِ آب سے میں نے
***

دوستوں سے کہو لوٹ جائیں ابھی، آج مہمان ہے ایک آیا ہوا
یہ ملاقات کے پھول اس کے لیے، جس کی خاطر میں ثروت پرایا ہوا

اک مکاں سرخ پھولوں سے آراستہ، گل زمینوں کو جاتا ہوا راستہ
صبحِ شفاف میں، چار اطراف میں، رنگ بکھرے ہوئے، ابر چھایا ہوا

دیکھ اے مہ جبیں، سرخوشی کے تئیں، جھومتا ہے فلک، ناچتی ہے زمیں
سبز تالاب کے آئینے پر کہیں، راج ہنسوں نے ہے غل مچایا ہوا

مجھ کو اس کے سوا اور کیا کام تھا، عرصۂ وقت میں بے در و بام تھا
آج پہنچا ہوں دہلیز و دیوار تک زخمِ آوارگی کا ستایا ہوا

زائروں کے لیے پنکھ پھیلائے گا، موسموں کی رفاقت میں پھل پائے گا

قریۂ آب و گل کے کنارے کہیں، پیڑ ہے ایک ہم نے لگایا ہوا

دیکھتا ہوں برستی ہوئی رات کو، نذر کرتا ہوں تیری مدارات کو
میرے دل کے خزانے میں اک پھول ہے، آسمانوں کی زد سے بچایا ہوا
***

کویل کو کو کرتی ہے اور پتے رنگ بدلتے ہیں
ایسے موسم میں شہزادے اٹھ کر نیند میں چلتے ہیں

آدھے سیارے پر پانی برس گیا نغمات لیے
آدھے سیارے کے منظر اب بھی آگ میں جلتے ہیں

یہ مٹی کے کورے مٹکے ان میں پانی رکھا ہے
یہ پھولوں کے گہوارے ہیں، ان میں بچے پلتے ہیں

باغ بھی چپ، فوارہ بھی چپ، کیسا عجب سنّاٹا ہے
کھینچے جو آزار دلوں نے، کب نغمات میں ڈھلتے ہیں

توسنِ شعر ہمارے حق میں تختِ سلیماں ہے ثروت

جن و ملائک پایہ تھامے آگے آگے چلتے ہیں

***

یہ رسمِ انبیا زندہ ہمی سادات رکھیں گے

جہاں پر آگ دیکھیں گے، وہیں پر ہات رکھیں گے

زمیں ہم سے تری بے رونقی دیکھی نہیں جاتی

کہیں دریا بہائیں گے، کہیں باغات رکھیں گے

نہیں ہے کربلا سے واپسی کا راستہ کوئی

جہاں بھی جائیں گے، شہزادیوں کو ساتھ رکھیں گے

یہ صبحیں اور شامیں کتنی بے چہرہ سی ہیں ثروت

سجا کر اِن دریچوں میں نئے دن رات رکھیں گے

***

دن نکلتا ہے

دن نکلتا ہے کسی اُجلے کبوتر کی طرح

آج کس نے میرے دل پر ہاتھ رکھا دھوپ کے پَر کی طرح

گھنٹیاں بجنے لگیں

ایک دروازہ کھلا

آج میرے ہاتھ میں اک پھول ہے

لوگ اتریں گے پہاڑوں سے کسی دن شہد کے پیالے لیے

گھڑ سواروں کے قدم سے جگمگائیں گے ببول

ہونٹ کھولیں گے رسول

شاعری کا ساتھ ہے

اک پری کا ہاتھ ہے

جس کی انگلی میں انگوٹھی جگمگاتی ہے کسی دل کی طرح

دل کی تہہ میں اک سمندر ہے جسے بیدار کرنا ہے مجھے

پار کرنا ہے مجھے

اُس کنارے جاؤں گا

گیت اور امید لے کر آؤں گا

تم یہاں اس نہر کے پُل سے مجھے آواز دینا

زندگی اک شور ہے ہنستے ہوئے گھر کی طرح

دن نکلتا ہے کسی اجلے کبوتر کی طرح

***

میں ایک آدمی کی موت مرنا چاہتا ہوں

میں ان کے درمیان سے اٹھ کر آگیا ہوں، بات یہ ہے کہ میرا علم بہت محدود ہے اور مجھے اصطلاحوں سے خوف آتا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ میرا شہر کس عرض البلد پر واقع ہے لیکن میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں جس کی انگلیاں قالین پر پھول کاڑھتی ہیں اور قالین سے اُڑنے والا اُون اُس کے پھیپھڑوں پر پھول کاڑھتا ہے

میرے دکھ بہت معمولی ہیں، میں دکھی ہوں اس مریض کے لیے جس کی بیل گاڑی اسپتال کے دروازے تک نہیں پہنچ پائے گی، میں دکھی ہوں اس عورت کے لیے جو اس بیل گاڑی کو جاتا ہوا دیکھتی ہے، میں دکھی ہوں اس بیلچے کے لیے جو بارشوں میں بھیگ رہا ہے، میں دکھی ہوں اوزاروں کے اس صندوق کے لیے جو میرے مرحوم باپ کی نشانی ہے

وہ مجھے پریشان رکھتے ہیں روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے اور بدل دیتے ہیں ایک باپ کو درندے میں، بدل دیتے ہیں ایک شاعر کو آگ میں....

میں درندے کی موت مرنا چاہتا ہوں

میں آگ کی موت مرنا چاہتا ہوں

میں ایک آدمی کی موت مرنا چاہتا ہوں....

***

مکاشفہ

جاننے کی ضرورت نہیں
علم رکھنا خوف کو دعوت دینا ہے
خوف کے ساتھ خدا بھی آجائے گا
علم حاصل کرنا آسان ہے
علم کو بھلانا بہت مشکل
مٹّی میں پیوست رہو
ننگے پیر چلو تاکہ انگلیاں مٹّی میں جڑ پکڑ سکیں
جڑیں جتنی گہری ہوں گی، شاخیں اتنی ہی اوپر جائیں گی
انسان کو مت آنے دو
وہ تمھاری شاخیں کاٹ ڈالے گا
تمھارے تنے کو چیر کر رکھ دے گا
دیکھو اس کے ہاتھ میں جو کلھاڑی ہے
اس کا دستہ بھی
کسی درخت کی لکڑی کا ہے
جبلّتوں میں زندہ رہو
یہی اصل جوہر ہے
تہذیب تصنّع ہے
لفظ، قلم اور مو قلم لے لو
بانسری لے لو

انسان کو مت آنے دو

انسان کا جوہر لے لو

وہ محبّت ہے

محبت اور حیوانیت کا نیا توازن نئی دنیا ہے

***

جہالت کا علم

باغ بان پھولوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے

گاڑی بان گھوڑے کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے

درخت زمین کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے

پرندے ہوا کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں

دیمک دروازوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے

آئینہ عورت کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے

عورت تخلیق کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے

ؕ***

میں ایک بچے کی طرح ہوں

میں ایک بچے کی طرح ہوں
جو پالتو جانور اور درندے ہیں فرق نہیں کر سکتا
میں اس کے بہت قریب چلا جاتا ہوں
ایک عورت جس کی چھاتیاں بھرپور ہیں
ہیں ان کی نوک پر اپنے ہونٹ رکھنا چاہتا ہوں
میں اس کے بازوؤں پر سر رکھ کر رونا چاہتا ہوں
....میں ایک بچے کی طرح ہوں
***

کاٹ دو اِس پیڑ کو

کاٹ دو اس پیڑ کو
جس کے سائے میں کوئی ماندہ مسافر
ایک پل سویا نہیں
کاٹ دو اس پیڑ کو
جس کے سائے ہیں کوئی عاشق کسی دن ٹوٹ کے

رویا نہیں

***

کھل اُٹھے پھول تم

کھل اٹھے پھول تم
اپنی خوشبوئیں گُم
ہر دریچے میں دن مسکرانے لگا
وہ پرندہ جو عرصے سے خاموش تھا
چہچہانے لگا

***

فوارے کی موت

گیت تھم گیا پانی کا
ریت سے اَٹ گیا فوّارہ
سوکھتے چلے گئے گل بوٹے
اب نہیں اُترتے پرندے
کسی نے منایا نہیں سوگ

....شاعر کے سوا

***

شاعری روٹھ گئی ہے مجھ سے

شاعری روٹھ گئی ہے مجھ سے
آسماں چپ ہے، زمیں بات نہیں کرتی ہے
بہتا پانی کسی امید پر آمادہ نہیں
خوش نہیں آتا کوئی لفظ، کوئی دروازہ
کیسے بچھڑے ہوئے لوگوں کی خبر لاتے ہیں
کس طرح روٹھے ہوئے شخص کو گھر لاتے ہیں
شہد کی مکھیاں پھولوں کی طرف جاتی ہیں
ایک فوارے کے نزدیک شجر گنتا ہوں

***

صبح اترتی ہے شہر میں

نقرئی گھنٹیاں بجاتی ہوئی صبح
اُترتی ہے شہر میں

فوارے کی اوٹ سے
بھیگا ہوا شہسوار
دیکھتا ہے
بار بار
زرد سنہری افق
جیسے فرشتہ کوئی
بکھیر رہا ہو زمین پر ورق
***ؐ

پتھر کی بینچ

خالی پڑی رہتی ہے
پارک کے ایک کونے میں
ہوائیں گزرتی ہیں
پتوں کو گراتی ہوئی
***

سیب کے باغ میں خود کلامی

باغ کے اندھیرے میں

سیب توڑ کر دیکھوں

آئینہ شکستہ ہے

پھر سے جوڑ کر دیکھوں

دشت و کوہ کی خاطر

شہر چھوڑ کر دیکھوں

***

آگ مجھ کو سبز کر

آگ مجھ کو سبز کر

اس قدر

کہ جنگلوں کے دیودار اپنا حُسن بھول جائیں

نہ دیر تک اداس رکھ

ناشتے کی میز پر

دودھ کا گلاس رکھ

آگ....

نان پز کے ہاتھ مت جلا

ظالموں کی کھیتیوں میں پھیل جا

***

ہوائے شب کے سامنے

ہوائے شب کے سامنے دیا لیے ہوئے ترے مکان تک گیا، ورق ورق گرے ہوئے تھے روشنی کے پھول دور تک زمین پر لکیر سی کھنچی ہوئی فلک تلک چلی گئی تو یہیں رکا، دیے کو طاق پر رکھا، اتارا شاخ سے گلاب اور دور کی دِشاؤں کو سراہتا ہوا پیالہ بھر مسرّتوں کی کھوج میں نکل کھڑا ہوا ...

***

سمندر سے روٹھا ہوا ایک ملّاح

سمندر سے روٹھا ہوا ایک ملّاح کل شام ساحل پہ یہ کہہ رہا تھا: فرشتو! مری بات مانو، سمندر کی جانب نہ جاؤ، یہیں ساحلی شہر کے بام و در کو سجاؤ کہ اس رات کی دسترس میں ستارے نہیں ہیں۔ کسی نے کہا: میں سمندر میں اُتروں گا، موتی چنوں گا، کسی جل پری سے وہ نغمہ سنوں گا جو دل میں شگوفے کھلاتا اترتا ہے پانی میں آغاز کرتا ہے اُس حمد کا جو کسی نے بلندی پہ روشن منارے کی صورت ابھاری ہے جس کے دریچے کسی اور ہی آسماں کی طرف کھل رہے ہیں....

***

بارشیں

(صلاح الدین محمود کے لیے)

....برس گئیں
عجوبہ بارشیں برس گئیں
رنگ اور سنگ پر
برس گئیں
عجوبہ بارشیں برس گئیں
مری نظر کی آخری حدوں تک
فلک فلک
برس گئیں
عجوبہ بارشیں برس گئیں
اے ابرِ سبز تھم ذرا
کہ میں زمین پر گری ہوئی کتاب اٹھا سکوں
خوشی کا گیت گا سکوں
***

خوب رُو چلتے اگر تم

خوب رو چلتے اگر تم

دور تک پھیلی زمیں پر
سر خوشی کے بیج بوتے
دیر تک پھولوں میں سوتے
خوب رو چلتے اگر تم
شہر کی بنیاد رکھتے
لوگ ہم کو یاد رکھتے
خوب رو چلتے اگر تم
***ؔ

دوپہر کی سلطنت

دوپہر کی سلطنت میں
فاختہ کچھ بولتی ہے
زندگی پر کھولتی ہے
نیند سے باہر نکل کر
میں نے اُس کے ہونٹ چکھے
آئینے پر پھول رکھے
دوپہر کی سلطنت میں
***

ایک مکمل عورت

وہ آئی اور اس نے تمام پنجروں کے دروازے کھول دیے
پرندے اڑ گئے
پرندے چہچہاتے ہوئے اڑ گئے
وہ آئی اور اس نے الگنی کو مضبوطی سے باندھ دیا
اور رنگ برنگے کپڑے دھوپ میں پھیلا دیے
وہ آئی اور اس نے سارے نام مٹا دیے
ایک صاف، کالی سلیٹ اس کے ہاتھوں میں آئینہ بن گئی
اس نے نہیں بتایا کہ اس نے آئینے میں کیا دیکھا
اتنے میں بادل گہرے ہو گئے اور ہوا چنگھاڑنے لگی
دروازے کھڑکیاں سر پٹکنے لگے
وہ ذرا بھی نہ گھبرائی
وہ ایک مرد کی موجودگی سے واقف ہے
***

ایک دراوڑ نظم

ہماری مٹّی جنگلوں سے خالی نہیں

لکڑی کی بہتات مجھے پریشان رکھتی ہے

میرے اوزاروں کے صندوق پر

تم نے تالا لگا دیا

بارش ہو رہی ہے

کالی مٹی بھیگی ہوئی ہے

میں ننگے پیر اس مٹّی پر چلتا ہوں

یہ کالی مٹّی آتش فشاں کے لاوے سے بنی ہوئی ہے

آگ اب ٹھنڈی ہو چکی ہے

لیکن عورتیں اس زمین پر اب بھی رقص کرتی ہیں

ہیالو ہیالو بدکما

بدکما بدکما ہیالو

***

قدیم سکھر

تمام راستے پانی کی طرف جاتے ہیں

ایک دن شہزادہ دریا پر پہنچے گا

وہ اپنی شہزادی کو پہچان لے گا

وہ کشتی کو کنارے پر لائے گا

محبت کا بیج محبت کے پھول لاتا ہے

بیج بونے کے لیے ایک باغبان کا دل چاہیے

وہ ایک گرم دن تھا

انھوں نے مجھے سایہ دیا

روٹی اور محبت کی یکجائی ہیں ایک کھڑکی کھلی

کھڑکی میں ایک دریا تھا

***

نیلی لکیر

ازل سے تم بہہ رہے ہو سندھو

قریب آؤ

ہمیں سناؤ وہ سارے قصے جو تم پہ بیتے ہیں اس سفر میں

اناج گھر میں

تمھاری زرخیزیوں کی چادر بچھی ہوئی ہے

جنوب کی سمت بہنے والے مہان سندھو

تمھیں مبارک شمال کی برف کا پگھلنا

تمھارے تہذیب یافتہ کنارے ابد کو آواز دے رہے ہیں

ہمارے ملّاح اور مچھیرے تمھاری چاہت میں نغمہ گر ہیں
زمیں کے نقشے پہ ایک نیلی لکیر جو مسکرا رہی ہے
وصال کا گیت گا رہی ہے
***

محبت کا بیج

سنو اے پرندو! کئی سال پہلے یہیں اس جگہ پر
محبت کا اک بیج بویا تھا میں نے، کنارے کی مٹی
کنارے کی زرخیز مٹی خفا تھی، ہوا تھی
مگر اس جگہ پر، محبت کا اک بیج بویا تھا میں نے
!سنو اے پرندو
برستے شگوفوں، ہرے بازوؤں کی یہ خاموش جنّت
کئی سال پہلے کے کھوئے ہوئے بیج کا آسماں تو نہیں
جس کو میں بھول بیٹھا تھا، وہ داستاں تو نہیں
***

دن نکلے تو میں بھی دیکھوں

دن نکلے تو میں بھی دیکھوں
باغیچے کا رنگ ہے کیسا
نیلے پھولوں والی بیلیں
اب تو چھت کو چھوتی ہوں گی
آسمان کی رنگت کیا ہے
اور ہوا میں اڑتے پنکشی
کوئی سندیسہ دیتے ہوں گے
بام کی اونچائی کے اوپر میرا سورج
کس پوشاک میں نکلا ہو گا
اور کوئی ان جانا دشمن
میری تاک میں نکلا ہو گا
***

عجائب گھر

اک ہاتھ پر اک ہاتھ تھا
کیا شام تھی، کیا نام تھا

اس سے ہمیں کیا کام تھا

وہ ہاتھ، وہ روشن دیا

شیشے کی اِس دیوار میں
اب بھی یہاں محفوظ ہے
***

مٹی

مدد گار مٹی، مدد گار مٹی کے سینے پہ بادل، ہری کھیتیوں کے سمندر، جزیرے، جہاں تک نظر جائے اودے افق پر پرندے، شرابور قریے، مضافات کو جاتی پگڈنڈیوں کے سہارے، کنارے کنارے، لڑکپن کے پھول اور معصوم پتے، فراموش گاری کے گہرے کنویں کی منڈیریں، منڈیروں پہ دیوے، مسافر تجھے کیا، تجھے دور جانا ہے، اس بیل گاڑی کے پہیے شکستہ ہیں لیکن ارادے مدد گار مٹی سے رس کھینچتے ہیں
***

یادیں

گئی گزری یادیں
گئی گزری یادوں کے کوزے ہیں پانی
کسی کی نشانی

گئی گزری یادوں کا ماتھا

گئی گزری یادوں کی اِک لٹ

گئی گزری یادوں کی چوکھٹ

دریچے کے دوپٹ

گئی گزری یادوں کا ہر پل

نمودار جنگل

گئی گزری یادوں کا دلکش زمانہ

گئی گزری یادوں کی خوش کن نفیری

طلسمِ اسیری ....

***

نیلی بارش

نیلی بارش تیری آنکھوں میں

جیسے یہ منظر

پہلے بھی دیکھا ہے میں نے

آئینے کے دل میں یا پھر اس دروازے میں

جو کالی مٹّی کے پاتال میں کھلتا ہے

کالی مٹی کا پاتال ہمارا بچپن

بچپن اور جنّت کی چڑیاں
(میرا دل اور میری آنکھیں)
اس نیلی بارش میں سب کچھ بھیگ رہا ہے
بھیگے رنگوں سے تصویر بناؤں
***

بندرگاہ میں صبح

جہازوں کے عرشے پہ لاکھوں فرشتے
ہلاتے ہوں رنگین رومال جیسے
مجھے مل گئے ہیں پر و بال جیسے
***

ایک اداس شہزادی

اتنی پیاری شہزادی کو کس نے اُداس کیا
اتنے اچھے دل کو ثروت کس نے توڑ دیا
اندھی برساتوں کے نیچے پھولوں کی بگیا
***

منھ زور گھوڑے

منھ زور گھوڑے

ہواؤں کے منھ زور گھوڑے

ہواؤں، صداؤں کے منھ زور گھوڑے

ہواؤں، صداؤں، گھٹاؤں کے منھ زور گھوڑے

ہواؤں، صداؤں، گھٹاؤں، دِشاؤں کے منھ زور گھوڑے

ہواؤں، صداؤں، گھٹاؤں، دِشاؤں، خلاؤں کے منھ زور گھوڑے

***

بنفشی دُھند

میں اپنے اوراق گن رہا تھا

کہ آن پہنچی بہارِ تازہ

بنفشی دُھند سے کسی نے

مجھے پکارا

***

بہار کا ایک دن

یوں ہی ایک دن میں نے پھولوں سے پوچھا
کہ اب تک کہاں تھے
انھوں نے بتایا کہ مٹی کے تاریک
سینے میں سوئے ہوئے تھے
گھنی کالی نیندوں میں کھوئے ہوئے تھے
وہیں پر چٹختے ہوئے بیج میں آنکھ کھولی
زمیں ہم سے بولی
کہ جاؤ
مٹی سے آزاد ہو جاؤ
تازہ ہواؤں میں گاؤ
سو ہم آ گئے ہیں
ہمارے وہ نغمے جو مٹّی میں سوئے ہوئے تھے
ہمارے لبوں پر بکھرنے لگے ہیں
پرندوں کا یہ چہچہانا ہمارا ہی رخ ہے
بہاروں کا موسم یہی ہے
یوں ہی ایک دن میں نے پھولوں سے پوچھا

***

میں تمھیں کیا دے سکتا ہوں

میں تمھیں کیا دے سکتا ہوں
تربوز کی ایک قاش جس پر ہمارے بچوں نے دانت گاڑ دیے ہیں
ایک جال جسے چوہوں نے جگہ جگہ سے کتر لیا
نظموں کی ایک کتاب جسے گھڑونچی کی بنیاد میں دفن کر دیا گیا
ایک پالنا جس کی رسیاں کاٹ دی گئیں
ایک کوچی جو پچھلے تیس سال سے رنگوں میں ڈوبی ہوئی ہے
ایک نام جس سے میں تمھیں پکارنا چاہتا ہوں
میں تمھیں کیا دے سکتا ہوں اس ہوادار مکان کے سوا
جہاں ہر چیز تمھارا انتظار کر رہی ہے
***

ماندگی کا وقفہ

....ایک کوا
ہانپ رہا ہے دیوار پر
مت اڑاؤ اسے

... ایک کتا

سو رہا ہے دیوار کے نیچے

مت جگاؤ اسے

آدمی کا سب سے پرانا دوست سو رہا ہے

ایک کتا سو رہا ہے

...ایک بچہ

ہڈیاں جمع کرتے ہوے

رک جاتا ہے

وہ اپنے تھیلے کو دیکھنا چاہتا ہے

اسے دیکھنے دو

...ایک کسان

سورج کے نیچے

ہل کی پھالی سے مٹّی چیرتے ہوے

کچھ سوچتا ہے

کسان اور سورج سے دُور

دارالحکومت میں

ایک ڈِکٹیٹر جماہی لیتا ہے

وہ اونگھنا چاہتا ہے

....جوابی انقلاب سے کچھ پہلے تک

وہ اونگھنا چاہتا ہے

مخیرّ عوام !

اُسے مہلت دو

اُسے مہلت دو

اُسے...

***

جل پری

میں اپنے ہونٹ اس کے بالوں پر رکھ دیتا ہوں
وہ خاموش رہتی ہے
وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی ہے
وہ مجھے ایسے دیکھتی ہے جیسے ایک عورت سمندر کو دیکھتی ہے
بہت قریب اور لا تعلق
پلٹتی ہوئی موج اس کے تلووں سے ریت بہالاتی ہے
وہ اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے
وہ ایک شیرنی ہے جو پانی کو دیکھتے رہنا چاہتی ہے
اس کا عکس ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے
وہ دیکھتی ہے کہیں بہت نیچے

فرن کا ہلتا ہوا پودا،
مونگے کی چٹان اور ایک جل پری
***

سیّال خیالات

سیّال خیالات کے دریائے فسوں میں
کشتی ہے بہت دیر سے تیار، ستارو

تم دھیان ذرا رکھنا، میں آتا ہوں، پکارو
سیّارہ کسی سرخ نگینے کی طرح ہے

کیا لوگ ہمارے لیے یکجا نہیں ہوں گے
سیّال خیالات کے دریائے فسوں میں
***

رات

رات آ پہنچی، سیّاروں کا تھال سجائے

بوجھل ہیں پھولوں کی آنکھیں، ہریالی میں
نیند کا در ہے، کسی کا کوئی نام نہیں ہے
***

رات

چمن کے بیچ فوارہ ستاروں کو بکھیرے جا رہا ہے
زندگی اس پل، کھلی زلفوں کی صورت مشک بُو ہے
یا، اساطیری اندھیرے میں سکوں کا سانس لیتی ہے
***

موجودگی کا پھول

مری موجودگی کا پھول پانی پر کھلا ہے، سلطنت
صبحِ بہاراں کی بہت نزدیک سے آواز دیتی ہے
سبک رفتار، پیہم گھومتے پہیے، گراں خوابی سے
جاگے، آفتابی پیرہن کا گھیر دیواروں کو چھوتا
پیار کرتا، رقص فرماتا، ارے، سورج نکل آیا!
***

فرشتگاں

(صلاح الدین محمود کے واسطے)

(۱)

نیند کا فرشتہ

زمیں اطراف کی کالی ہوئی، جلنے لگے دِیوے
ہوائیں خشک پتّوں کو گرا کر سو گئیں شاید
فرشتہ نیند کا ناراض ہے، مجھ سے یہ کہتا ہے
بہت دن سو لیے، بیدار رہ کر بھی ذرا دیکھو
اذانِ فجر ہونے تک ستاروں کی ادا دیکھو

(۲)

باران کا فرشتہ

باران کا فرشتہ
ست رنگا پھول تھامے
نیچے اُتر رہا ہے

(۳)

شش جہات کا فرشتہ

فرشتۂ شش جہات اکثر
ہمارے اطراف کی زمیں پر
گلابِ تازہ بکھیرتا ہے

(۴)

آفرینش کا فرشتہ

آفرینش کا فرشتہ
کاغذی قندیل تھامے
گفتگو کرتا ہے مجھ سے

(۵)

شادمانی کا فرشتہ

!شادمانی کے فرشتے
صبح ہیں چہرہ ہے کس کا
جھلملاتی شام کیا ہے
وہ جو آتی ہے چمن میں
اُس پری کا نام کیا ہے؟

(٦)

نسیان کا فرشتہ

!نسیان کے فرشتے
وہ یاد محو کر دے
جو میرے دل کی تہہ میں
کانٹا بنی ہوئی ہے

(۷)

آشنائی کا فرشتہ

!آشنائی کے فرشتے
اُن زمینوں کا پتا دے

جو مری مانند تنہا
ہجر کا دکھ سہہ رہی ہے

(۸)

خودکشی کا فرشتہ

خودکشی کے فرشتے کو آنے نہ دو
اس اکیلے دیے کو بجھانے نہ دو
خودکشی کے فرشتے کو آنے نہ دو

(۹)

تہجد کا فرشتہ

تہجد کا فرشتہ نیم شب کی خانقاہوں میں
اُترتا ہے، بڑی دھیرج سے میری بات سنتا ہے
اذانِ فجر ہونے تک زمیں سے پھول چنتا ہے

(۱۰)

اُداسی کا فرشتہ

!اداسی کا فرشتہ پنکھ پھیلائے ہوے اے دل

اترتا ہے مرے دالان ہیں سادہ ورق لے کر

یہی سادہ ورق آغاز ہے میری کہانی کا

(۱۱)

سخاوت کا فرشتہ

سخاوت کے فرشتے کو اترتا دیکھ کر سورج

ہوا روپوش بادل میں، زمیں کہنے لگی، آؤ

طلائی، نقرئی سکے اُچھالو شادمانی کے

کھلیں اوراق لوگوں پر کتابِ زندگانی کے

(۱۲)

ابدیت کا فرشتہ

ہری گھنٹیاں

ہری ہوائیں

ہرا سمندر

ہری سلاخیں

ہرے پرندے

ہری قیامت

ہرا جنم دن

***

جھٹ پٹے
(سائیں مرنا کی یاد میں)

مرنا تیری خامشی، بھید بھرا پاتال
اندر کا احوال، شاعر کا دل جانتا

مرنا تیری انگلیاں، اِکتارے کی گونج
گرتی گھائل کونج، پنکھ پسارے جھیل پر

مرنا تیرے بول، اڑ جائیں پر کھول
جیسے غول کے غول، پکشی دُور دِشاؤں میں

اک دیوارِ اجل، جلتا بلتا تھل

ڈھونڈ رہا ہر پل، اپنے موسیقار کو

اِکتارے کی کاٹ، نیندیں کرے اچاٹ
سونے ہیں گھر گھاٹ، گرد گرد ہے چاندنی

مرنا تیرا رنج، میرے دل کے بیچ
آب و گل کے بیچ، جیسے اکیلا ہنج 1

1۔ ہنس
***

علّن فقیر کے واسطے

اللہ سائیں امن کی کونپل پھوٹے پاکستان سے
سورج ابھرے، سورج ابھرے، سورج ابھرے شان سے

سندھ ندی کا پانی پیارا
بہتی دھارا
سچا عرب سمندر سارا

دیکھے کیسی آن سے

اللہ سائیں امن کی کونپل پھوٹے پاکستان سے

پاک پتن کی پیاری مٹّی

پھول کھلائے شان سے

اللہ سائیں امن کی کونپل پھوٹے پاکستان سے

تھر کی مٹی بدل دے سائیں

ٹھنڈے نخلستان سے

اللہ سائیں امن کی کونپل پھوٹے پاکستان سے

جرأت اور شجاعت والے

آئے بلوچستان سے

اللہ سائیں امن کی کونپل پھوٹے پاکستان سے

سرحد کے غیور جیالے

اترے ہیں ڈھلوان سے

اللہ سائیں امن کی کونپل پھوٹے پاکستان سے

سورج ابھرے، سورج ابھرے، سورج ابھرے شان سے

اردو بولی، قومی بول

پھوٹی ہے گل دان سے

اللہ سائیں امن کی کونپل پھوٹے پاکستان سے

سورج ابھرے، سورج ابھرے، سورج ابھرے شان سے

***

نوٹ: خاکدان مجموعہ 1998 میں شائع ہوا تھا۔

ایک کٹورا پانی کا/کلیات ثروت حسین

(شمائلہ ثروت کے نام)

تعمیر کی بنیاد میں دل رکھا ہے میں نے

ہم لوگ اٹھائیں گے مکاں اور طرح کا

سمندر سے ایک کٹورا پانی

ایک عمراور اپنی نسل کا سب سے بڑا شاعر ثروت حسین۔ سچا شاعر اور انوکھا شاعر۔ میں قلندرانہ نثر لکھنے کا احساس رکھتا ہوں مگر ثروت ایسے لوگوں میں سے ہے جن کے لیے لکھتے ہوے میری تخلیقی بے
قراری، سرشاری، شکر گزاری اور انکساری میری اپنی مٹی میں مل جاتی ہے اور میں اس کی شاعری پڑھنے لگتا ہوں ۔ایسا میں کئی بار کرچکا ہوں۔ اس کی شاعری میری ہمت بندھاتی ہے۔ یہ مطالعہ ایک رفاقت جیسا ہے۔ اس کے ساتھ میری رشتہ داری شاعری کے حوالے سے ہے۔ یہ ان دیکھے کی محبت ہے جو بڑھتی ہی رہتی ہے۔ اس کے مرنے کے بعد تو اور بڑھتی جارہی ہے۔ سوچتا ہوں میرا کیا بنے گا۔
وہ صرف اور صرف شاعر تھا۔ اس نے زندگی نہ کی شاعری کی۔ شاعری نہ کی زندگی کرلی۔ زندگی اور شاعری نے مل کر اس کے وجود میں وجد پیدا کیا۔ اس دھمال نے اسے بھونچال میں رکھا۔ وہ اپنے جیسے لوگوں کی تلاش میں ہو گا۔ اس کے جیسے لوگ آج بھی اس کی تلاش میں ہیں۔ دونوں ناکام رہے دونوں کامیاب ہوے۔ کامیابی اور ناکامی کا ایسا امتزاج اس کے تخلیق مزاج کا حصہ تھا جو خاک اور خواب کے سانجھے ماحول میں رواج پاتا ہے۔ یہ ماحول اسے اپنے باہر کہاں ملتا۔ وہ جو زندگی اس کے اندر تھی، اسے اپنے باہر بسر کرنے کی لگن اسے کہاں سے کہاں تک لیے لیے پھری۔ اپنی ہی کسی سرزمین کی سرحد پر کھڑے ہو کے اس نے بات کی۔
وہ اپنے اندر بھی بہت چیزیں گم کر بیٹھا تھا۔ وہ گمشدہ چیزیں تلاش کرنے کے حق میں نہ تھا۔ گمشدگی کے عالم میں اسے مزا آتا تھا۔ اس نے شاعری ایسے ہی کسی عالم میں کی۔ اس نے عمر نہ گزاری زمانہ گزارا ہے۔ وہ اپنی تلاش میں رہا جیسے زمین اپنے زمانے کو ڈھونڈتی ہے، وہ دوسروں کے درمیان ایسے تھا جیسے گندے پانی کے جوہڑ میں کنول۔ سمندر جیسے دھیان رکھنے والے کے لیے یہ مثال بہت چھوٹی ہے۔ مگر چھوٹے لوگوں کے لیے یہ بہت بڑی مثال ہے۔ وہ بے مثال شاعر ہے۔ اس نے اپنی ایک نظم جل پری میں کہا۔
وہ مجھے ایسے دیکھتی ہیں جیسے ایک عورت سمندر کو دیکھتی ہے۔

:تو یہ شعر ان عورتوں کے لیے نہیں ایسوں ویسوں کے لیے کہا گیا ہو گا

چھوٹے چھوٹے لوگ تھے اور چھوٹی چھوٹی خواہشیں

سو میں ان کے درمیاں اک داستاں ہوتا گیا

:تو پھر یہ لوگ کہاں ہیں جن کے لیے یہ شعر ثروت ؔ نے کہا ہے

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے

لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

کیا اسے معلوم تھا کہ وہ مر جائے گا۔ اس کے بعد تو یہ ثابت ہے کہ موت کے بعد ہی اصل زندگی ہے۔ اس نے یہاں بھی وہی زندگی گزاری، وہ وہاں یہ زندگی گزار رہا ہو گا۔ اس کی شاعری میں اس زندگی کا سراغ پایا جاتا ہے۔ وہ چراغ تو :ہے جس کی روشنی میں ہم وہ زندگی دیکھ سکتے ہیں ایک تخلیقی جانکنی انہونی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتی تھی

موت کے درندے میں اک کشش تو ہے ثروت ؔ

لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خودکشی کے بارے میں

کہتے ہیں اس نے خودکشی کی تو پھر خودکشی اور شہادت میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہیں لکھا تھا کہ جنرل نیازی ڈھاکے کے پلٹن میدان میں خودکشی ہی کر لیتا تو میں فتویٰ دیتا کہ یہ شہادت ہے۔ یہ معرکہ ثروت ؔ نے اپنی ذات میں کیا کر دیا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے اندر شہید ہو چکا تھا۔ شہید بھی اپنے آپ کو اس نے خود کیا ہو گا۔ جو سچی طرح خودکشی کرتے ہیں وہ غلط نہیں ہوتے۔ میں شاید اس کے لیے بات کرتے کرتے اس کی یاد کے کسی غیر آباد علاقے میں جا پڑا ہوں۔

آدمی قاتل ہوتا ہے یا مقتول ہوتا ہے یہ کیا کہ آدمی بیک وقت قاتل بھی ہو اور مقتول بھی ہو۔ ایک وجود میں :دو کردار۔ میں نے شاید اس کے لیے ہی کہا تھا

تو جو قاتل ہے تو مقتول کہوں میں کس کو

تو جو گلچیں ہے تو پھر پھول کہوں میں کس کو

ثروتؔ کے وجود میں کئی کردار ادا ہو رہے تھے۔ اس کی شاعری میں کئی کردار بولتے ہیں اور ہواؤں میں بنے ہوئے دروازے کھولتے ہیں۔ ان دروازوں کے پار کیسے کیسے جہان ہیں۔ وہ ان جہانوں کی سیر کر آیا تھا۔ اسے پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ کئی جہان واقع ہوے چلے جا رہے ہیں۔

مجھے لیڈی ڈیانا کی موت پر کہنے کے لیے کہا گیا تو میں نے ثروتؔ کا شعر پڑھ دیا تھا:

شہزادی ترے ماتھے پر یہ زخم رہے گا

لیکن اس کو چومنے والا پھر نہیں ہو گا

خاص طور پر ہونے والے واقعات کے حوالے سے اس غزل کا کوئی نہ کوئی شعر پڑھا جا سکتا ہے۔ ثروتؔ کو یاد کرتے ہوے خواہ مخواہ شکیب جلالی کو یاد کیا جاتا ہے۔ باخبر زمانے کے لوگ کیسے بے خبر ہیں۔ ثروتؔ اہلِ خبر میں سے تھا۔ اس کا موازنہ اپنے زمانے کے کسی شاعر اور شخص سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اکلوتا تھا اور اکیلا۔ یکہ و تنہا اور یکتا۔ وہ جو کچھ ایک لمحے میں ہوتا تھا دوسرے لمحے میں خود بھی نہیں ہو سکتا تھا:

میں نے خود کو جمع کیا پچیس برس میں

یہ سامان تو مجھ سے یکجا پھر نہیں ہو گا

وہ نغمے جو سانولی مٹی میں سوئے ہوے تھے۔ اس نے انہیں اپنے وجود کی دھول میں پھول کیا۔ لگتا ہے اس نے ویران اور حیران مٹی میں کھلے ہوے پھولوں سے مشورہ کر کے شاعری کی تھی۔ میں جب جب اس کے شعر پڑھتا ہوں ان میں کوئی نئی خوشبو رقص کرنے لگتی ہے۔ یہیں کہیں اس نے انجانی محبت کا بیج بویا تھا۔ وہ داستان جسے وہ خود بھی بھول بیٹھا تھا اس کا خلاصہ اس کی شاعری میں ہے۔ وہ اپنی ہی بھولی بسری یادوں کا شاعر ہے۔ اس نے جن عورتوں کو ہجر کی ماری زمین پر رقص کرتے دیکھا تھا، انہیں اپنی شاعری کی وصال آمادہ بستیوں کی طرف ہجرت

کرنے پر مائل کیا۔ میں نے ایسی کچھ عورتوں کو اس کا پیغام دے کر ملاقات کرلی ہے۔ان میں وہ مکمل عورت بھی تھی جو مرد کی موجودگی سے پوری طرح واقف تھی۔ جس طرح دوسریاں واقف نہ تھیں۔

اس نے شاعری کی جیسے کسی روٹھے ہوئے کو گھر میں لاتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں پھولوں کی طرف جاتی ہیں۔ خدا نے کہا کہ میں نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔اس وحی کی تفسیر ثروتؔ کی شاعری میں ملتی ہے۔ وہ ایک بچے کی طرح تھا سچا اور معصوم۔ وہ جنت کا باشندہ تھا۔ بچہ پالتو جانور اور درندے میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں کے بہت قریب چلا جاتا ہے۔ بچہ تو بچہ ہوتا جس عورت کی چھاتیاں بھرپور ہوں ان کی نوک پر اپنے ہونٹ رکھنا چاہتا ہے۔ ثروتؔ نے کس عورت کا دودھ پی لیا تھا کہ یہ ذائقہ اسے جنت کی طرف بلاتا رہا اور وہ وہاں چلا گیا۔ وہ کئی نشانیاں اپنی شاعر میں چھوڑ گیا:

اپنے مکاشفوں کے ساتھ اپنی کہانیوں کے ساتھ
آیا ہوں میں زمین پر اپنی نشانیوں کے ساتھ

یہ تو طے ہے کہ نرے علم سے شاعری نہیں ہوتی۔ شاعری کے لیے کوئی تو علم چاہیے۔ میرے خیال میں علم راز ہے اور راز دو آدمیوں کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ ثروتؔ جیسے تنہا آدمی کو ملتا ہے۔ جہالت بھی کوئی علم ہے تو شاعری کے لیے یہ بہت کار آمد ہے۔ ثروتؔ کہتا ہے:

آئینہ عورت کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے
عورت تخلیق کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے

وہ عورت کے بارے میں اس سے زیادہ نہ جانتا ہوگا۔ مگر اس کے اندر جو عورت تھی اس کے بارے میں تو زیادہ جانتا ہوگا۔ بعض اوقات نہ جاننا جاننے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اپنی تنہائی میں وہ کن عورتوں سے باتیں کرتا تھا۔ خود کلامی کو ہم کلامی کا درجہ اس نے دیا۔ اس نے یہ بھی تو کہا تھا:

مٹی پہ نمودار ہیں پانی کے ذخیرے

ان میں کوئی عورت سے زیادہ نہیں گہرا

ثروتؔ کے ہاں کسی صوفیہ کا ذکر ملتا ہے۔اس عورت سے ثروتؔ کی ملاقات شاعری میں ہوئی ہو گی۔ میں اس کے علاوہ بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کسی زمین پر تو ہو گی۔ شاعری بھی اک سر زمین ہے۔ یہ ثروت کی دل دھرتی ہے۔ کسی مقام پر تھا ثروتؔ کہ جہاں دھرتی اور دل دھرتی ایک ہو جاتی ہے:

صوفیہ تم سے ملاقات کروں گا اک روز
کسی سیارے کی جلتی ہوئی عریانی میں
میں نے انگوروں کی بیلوں میں تجھے چوم لیا
کر دیا اور اضافہ تیری حیرانی میں

جھوم رہی ہے زندگی ناچ رہی ہے اجل
سن تو سہی صوفیہ آج ہوا میں نکل
چھوڑ یہ گل پیرہن چوم لے میرا بدن
اس کے سوا کچھ نہیں تیری اداسی کا حل

آگ میں یا آب میں رہتی ہو تم
صوفیہ کس خواب میں رہتی ہو تم
شیرنی رہتی نہیں دیوار میں
کس لیے آداب میں رہتی ہو تم
ساتواں دریاب ہے ثروت حسین

جانے کس پنجاب میں رہتی ہو تم

آخری شعر میں نے اس لیے نہیں لکھا کہ صوفیہ صرف پنجاب میں رہتی ہے۔ سندھ بھی قریہ حسن عشق ہے۔ یہاں پنجاب صرف قافیے کے لیے نہیں آیا۔ ثروتؔ پنجاب میں کسی اور پنجاب کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ بہر حال ثروتؔ کی صوفیہ کا اختر شیرانی کی سلمیٰ وغیرہ سے موازنہ توہین ہے۔ ثروت کی بھی اور صوفیہ کی بھی۔ میں سوچتا ہوں کہ صوفیہ صوفی کی مونث تو نہیں۔ صوفیہ بھی ثروت کی شاعری کا تحفہ ہے۔ اسے ملیں اور اس کے لیے ثروت کی شاعری پڑھیں :

زمانہ ہوا اس کو دیکھے ہوے

کسی دن وطن کی طرف جاؤں گا

تلاش مسرت میں دیوانہ وار

میں کارِ سخن کی طرف جاؤں گا

میں نے ثروت کی کافی پہلی بار پڑھی

آکھو آکھو آکھ

ساری رات جلا میں ثروتؔ

پھر بھی ہوا نہ راکھ

یہ رات عمر بھر میں پھیل گئی ہے۔ وہ جلتا ہی رہا۔ اس آگ نے جلا کے اسے سبز کر دیا۔ پھر وہ سرسبز ہو گیا۔ سرمست اور سربلند۔ جس زمین پر وہ بے قرار ہوا، وہ سرزمین بن گئی۔ میں اسے یاد کرتا ہوں یعنی اس کی شاعری یاد کرتا ہوں تو میرے اندر ہر طرف راکھ ہی راکھ اڑتی ہے۔ ثروتؔ نے اس راکھ میں قلم ڈبو کے لکھا اور اس کے لفظوں میں چراغ ہی چراغ جل اٹھے، ثروتؔ نے یہ چراغ بجھا کے بھی دیکھ لیے۔ سانولا اندھیرا اس کا دوست ہو گیا۔ لگتا ہے کہ جو کچھ ہے اندھیرے میں ہے۔ جو نظر نہیں آتا، بس وہی ہے ثروت نے کیا دیکھ تھا کہ اس کی شاعری سارے زمانے میں

ہونے والی شاعری سے مختلف ہے۔ لفظ مختلف یہاں مجھے حقیر سا لگا ہے۔ وہ ایسا مختلف تھا کہ اسے مختلف کہتے ہوئے جی نہیں بھرتا:

آگ اور طرح کی ہے دھواں اور طرح کا
ہے کچھ مرے جلنے کا سماں اور طرح کا
دیتے ہیں خبر خوش گزراں اور طرح کی
کرتے ہیں سخن دل زدگاں اور طرح کا
تعمیر کی بنیاد میں دل رکھا ہے میں نے
ہم لوگ اٹھائیں گے مکاں اور طرح کا

میں نے دو تین بار ثروتؔ کا یہ شعر گنگنایا:

بادل گرجے دیواروں میں بجلی چمکی آئینے میں
اس نے اپنے ہونٹ جو رکھے میرے بالوں بھرے سینے میں

تو ایک دوست کہنے لگا کہ یہ تو فحش کلامی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میرے بالوں بھرے سینے پر اپنے ہونٹ رکھے تھے کسی نے مگر میں نے ثروتؔ کا شعر پڑھ کر جو نشاط پائی ہے۔ اس باوضو لذت بھری سرشاری کا اشارہ بھی تب نہیں ہوا تھا۔ یہ تو خیالوں میں کسی تجربے کی تخلیقی یاد ہے جس میں ثروتؔ نے ہمیں بھی بھگو دیا ہے۔ ایسی ہی بات کسی نے بہت بڑے تخلیقی وجود منیرؔ نیازی کے لیے کہی تھی کہ وہ شاعر تو بہت بڑا ہے مگر شراب پیتا ہے۔ میں نے کہا

تھا کہ شراب جب منیر خان کے اندر جاتی ہے تو خواب اور گلاب ہو جاتی ہے۔ تم نہ پینا۔اس طرح شراب واقعی خراب ہو جائے گی۔

شاعری میں جو محبوب ہے وہ کس نے دیکھا ہے۔ یہ کوئی اور ہی مخلوق ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ثروتؔ نے محبوب کو آنکھ بھر کے دیکھا ہو گا:

میں نے اس کو چوم کے دیکھا تھا ثروتؔ

برف برستی تھی، انگارہ پھول میں تھا

وہ کون ہے اور یہ چومنا کیا ہے۔ کاش سب لوگ اس تجربے سے گزر سکیں ورنہ ثروتؔ کی شاعری پڑھیں اس تجربے سے گزر جائیں گے۔

میں نے ساقیؔ فاروقی کے لیے ثروتؔ کے اشعار پڑھے تو وہ مجھے اچھا لگنے لگا:

بجھی روح کی پیاس لیکن سخی

مرے ساتھ میرا بدن بھی تو ہے

یہ نجانے کس ساقیؔ کی طرف اشارہ ہے۔ نئی کتاب میں بظاہر کسی شعر میں کسی طرف اشارہ نہیں مگر میری طرح شاید کوئی یہ سمجھے کہ یہ شاعری اس کے لیے ہے میں یہ چند سطریں ثروتؔ کے لیے کہنے کے بعد سرخرو نہیں بھی ہوا تو سرشار ضرور ہوا ہوں۔ سمندر میں ایک گلاس پانی ڈالیں تو اس کا کیا ہو گا۔ میں نے یہ ایک کٹورا پانی کا خود پی لیا ہے اور پھر بات کی ہے۔(ڈاکٹر محمد اجمل نیازی)

ہے وقتِ امتحان، بھلے دن بھی آئیں گے

مہکے گا گلستان، بھلے دن بھی آئیں گے

سوئیں گے دل گرفتہ و دل ریش سکھ کی نیند
بدلے گا یہ جہان، بھلے دن بھی آئیں گے

رنجیدہ کیوں ہے کوئی ستارہ اگر نہیں
دل کو چراغ جان، بھلے دن بھی آئیں گے

پھر جمع ہوں گے آگ کے چو گرد قصہ گو
چھیڑیں گے داستان، بھلے دن بھی آئیں گے

اطراف سے دیار کی مہماں سراؤں میں
اتریں گے میہمان، بھلے دن بھی آئیں گے

ہاتھوں میں شمع دان لیے باغ و راغ میں
نکلیں گے نوجوان، بھلے دن بھی آئیں گے

پتوں کی تالیوں سے، پرندوں کے شور سے
گونجے گا ہر مکان، بھلے دن بھی آئیں گے

فردا کی گونج سن کے اٹھیں گے جہاز راں
کھولیں گے بادبان، بھلے دن بھی آئیں گے

کیوں سو گیا ہے ہاتھ سرہانے دھرے ہوئے
ثروتؔ- خدا کو مان، بھلے دن بھی آئیں گے
***

آگ اور طرح کی ہے دھواں اور طرح کا
ہے کچھ مرے جلنے کا سماں اور طرح کا

یہ شہر ہے، مٹی ہے یہاں اور طرح کی
یہ دشت ہے، پانی ہے یہاں اور طرح کا

دیتے ہیں خبر خوش گزراں اور طرح کی
کرتے ہیں سخن دل زدگاں اور طرح کا

پر مل گئے مٹی کو تو آنکھوں پہ کھلا یہ
منظر ہے سرِ کاہکشاں اور طرح کا

تعمیر کی بنیاد میں دل رکھا ہے میں نے
ہم لوگ اٹھائیں گے مکاں اور طرح کا
***

یک بار گی زمین ہلی، آسماں چلا
ایسے میں اُس کی آنکھ کا جادو کہاں چلا

ہاں زمزمہ سرائی کا اعجاز دیکھنا
جب میں چلا تو ساتھ مرے گلستاں چلا

باہر خزاں کی شام ہے، لب بستہ پیڑ ہیں
آئینے سے نکل کے ستارہ کہاں چلا

یہ دشت اپنی پیاس لیے منتظر رہا
کس شہر کی تلاش میں ابرِ رواں چلا

دروازے سے اُترتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس
ثروتؔ گلاب رکھ کے کوئی نوجواں چلا
***

باغ تھا مجھ میں اور فوارہ پھول میں تھا
منظر یہ سارے کا سارا پھول میں تھا

راسیں تھامے ٹھہر گیا میں رستے میں
جیسے جنت کا نظّارہ پھول میں تھا

تند ہوائیں لے گئیں اس کو ساتھ اپنے
ہاں یارو، اک شخص ہمارا پھول میں تھا

جلتی آنکھ میں ریگِ بیاباں اڑتی تھی
آنکھ لگی تو میں دوبارہ پھول میں تھا

میں نے اُس کو چوم کے دیکھا تھا ثروتؔ
برف برستی تھی، انگارہ پھول میں تھا
***

آدمی کی محنتوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
زندگی کو صرف تمثالِ خزاں سمجھا تھا میں

ارضِ اسفل کی بہاریں اور انسانوں کے گھر
یہ کرہ من جملۂ سیّارگاں سمجھا تھا میں

ایک ہے سب کی مسافت، ایک ہے سب کا سفر
منتشر لوگوں کو کیوں بے کارواں سمجھا تھا میں

کچھ تو موسم کا فسوں تھا اور کچھ وہ راستا
ہر شجر کو ہم سکوت و ہم زباں سمجھا تھا میں

جب تلک ثروتؔ کسی کی ہمرہی حاصل نہ تھی
آب اور افلاک کا مطلب کہاں سمجھا تھا میں
***

جز عشق محاذِ رم و پیکار نہ رکھوں
مر جاؤں مگر ہاتھ سے تلوار نہ رکھوں

اپنی ہی کسی آگ میں جل جاؤں سرِ شام
اب اُس کے چراغوں سے سروکار نہ رکھوں

جب اس نے مجھے شعلۂ جوّالہ کیا ہے
لازم ہے اندھیروں سے بہت پیار نہ رکھوں

خنجر ہوں تو پیوست بھی ہونا ہے کہیں پر
سو اس کے علاوہ کوئی معیار نہ رکھوں

اس معرکۂ عشق میں اپنے لیے ثروتؔ
کیا رکھوں اگر نشّۂ پندار نہ رکھوں
***

اپنے مکاشفوں کے ساتھ، اپنی کہانیوں کے ساتھ
آیا ہوں میں زمین پر اپنی نشانیوں کے ساتھ

ایک ہی دن بسر کیا کتنے ہی اختلاف سے
صبح کو آئینوں کے ساتھ، شام کو پانیوں کے ساتھ

چہرۂ آب ہوں مگر سب سے الگ ہوں سر بسر
اور بہت سے وصف ہیں مجھ میں روانیوں کے ساتھ

رات بہت طویل ہے، چاند ہے اور جھیل ہے
کاش کبھی تو جل بجھوں رنگ فشانیوں کے ساتھ

***

یہ سب سنان و سپر تیرے نام کرتا ہوں
میں آج تجھ پہ محبت تمام کرتا ہوں

یہ فرشِ دل ترے شایان تو نہیں لیکن
ذرا ٹھہر کہ کوئی انتظام کرتا ہوں

میں انتظار بہت دیر کر نہیں سکتا
غروبِ مہر سے پہلے ہی شام کرتا ہوں

کوئی پیالہ نہیں اور شام آپہنچی
سو تیغِ تیز تجھے بے نیام کرتا ہوں

یہ بات اس کو بہت دیر سے ہوئی معلوم
کہ میں تو صرف اسی سے کلام کرتا ہوں

***

فرد نہیں، ہجوم ہوں، میرا شمار تو کرو
مجھ کو اسیر تو کرو، مجھ کو شکار تو کرو

شہرِ خزاں ہے اور ہم، ایک دھواں ہے اور ہم
اس تگ و دو میں کم سے کم ذکرِ بہار تو کرو

لوگ نڈھال ہیں تو کیوں، بے پر و بال ہیں تو کیوں
زندگیوں کے باب میں سوچ بچار تو کرو

فرش و گیاہ و بام و در، اب بھی حسین ہیں مگر
صبح سے عشق تو کرو، شام سے پیار تو کرو
***

کہتی ہے نگاہِ آفریں کچھ
پھول اتنے کہ سوجھتا نہیں کچھ

بادل جھک آئے آئینے پر

بدلی بدلی سی ہے زمیں کچھ

اس کی ہی قبا سے ملتی جلتی
دیوارِ گلاب و یاسمیں کچھ

دیتا ہے سراغ فصلِ گل کا
فوارۂ سحرِ نیلمیں کچھ

کھلتا نہیں بھید روشنی کا
جلتا ہے قریب ہی کہیں کچھ

نظریں تو اٹھاؤ، مجھ کو دیکھو
تم بھی تو کہو اے ہم نشیں کچھ

آئینے میں موج زن ہے ثروتؔ
مہتابِ گناہِ اولیں کچھ
***

بادل گرجے دیواروں میں، بجلی چمکی آئینے پر

اس نے اپنے ہونٹ جو رکھے میرے بالوں بھرے سینے پر

پھر یہ پرند نہیں چہکیں گے، پھر یہ پھول نہیں مہکیں گے
مٹی کی موسیقی سن لو میرے دل کے سازینے پر

انگوروں کا رس تو میں نے اس سے پہلے بھی چکھا تھا
اور ہی آگ دہک اٹھی ہے تیرے ہونٹوں سے پینے پر

میرے گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج رہے ہیں معبد و مقتل
لیکن وہ خاموش کھڑی ہے پتھر کے اونچے زینے پر
***

ایک دیا مستقل آئنہ خانے میں ہے
عکس نئے سے نیا تیرے خزانے میں ہے

جیسے زمیں ہے نئی، جیسے سفر ہے نیا
جانیے کیسی خوشی آگ جلانے میں ہے

حرفِ وصال و فراق، دیکھ صداؤں کا طاق

لطف ملاقات کا چھوڑ کے جانے میں ہے

پھول، شجر، جانور، یعنی مرا مستقر
اپنی زمینوں پہ ہے، اپنے گھرانے میں ہے

سن مرے ثروت حسین، بھائی ترا اصاد قین
اب بھی خدا کے حضور نقش بنانے میں ہے
***

کسی کی یاد کو آرامِ جاں بنایا تھا
بڑے جتن سے کوئی سائباں بنایا تھا

ہوا نے چاٹ لیا، بارشوں نے دھو ڈالا
ردائے خاک پہ میں نے نشاں بنایا تھا

بساطِ لالہ و نسریں بچھانے والے نے
مرے وجود کو آتش بجاں بنایا تھا

بس اس قدر ہے حکایت کہ راہ چلتے ہوئے

وہ ایک گل تھا، اسے گلستاں بنایا تھا

مکاں ضرور بنایا تھا اس خرابے میں
مجھے خبر نہیں ثروت کہاں بنایا تھا
***

ہر چند بارِ آسماں انسان سے اُٹھا
یہ راہ پُر خطر ہے قدم دھیان سے اُٹھا

یارانِ خوش معاملہ نزدیک آ گئے
میں گرد جھاڑتا ہوا دامان سے اٹھا

سویا وہ کیا کہ پہلے پہر نیند آ گئی
اٹھا وہ کیا کہ صبح کے اعلان سے اٹھا

بلقیسِ خوش جمال کو پا کر بہت قریب
دیوانہ وار تختِ سلیمان سے اٹھا

تو نے چھپا کے رکھے ہیں مہتاب کس لیے

جانِ جہان! ہاتھ گریبان سے اٹھا

ثروتؔ اداس کیوں ہے ہوائے بہار میں
اک پھول اس کے واسطے گل دان سے اٹھا

***

ایسا بھی کوئی مہرباں جو مرے ساتھ چل سکے
بارِ ستم اُٹھا سکے، نظمِ جہاں بدل سکے

تیرہ و تار ہے زمیں، پاس مرے کوئی نہیں
میں اسی فکر میں غمیں، میرا چراغ جل سکے

کارگہہِ وجود میں ابر و ہوائے پیش و پس
میری یہی دعا کہ بس آدمی پھول پھل سکے

عشق کا نام چاہیے، حسنِ کلام چاہیے
ایسا کوئی سخن نہیں، شعر میں جو نہ ڈھل سکے

زندگی کی رمق ملے، ایک نیا افق ملے

ساتھیو، گرد و پیش کی برف اگر پگھل سکے

***

آنکھ تاریک مری، جسم ہے روشن میرا
در و دیوار سے ٹکراتا ہے آہن میرا

اور اب ہاتھ مرا قبضۂ شمشیر پہ ہے
یہی جوہر ہے مرا اور یہی فن میرا

آج میں تم کو جلانے کے لیے آیا ہوں
تم نے اک روز اُجاڑا تھا نشیمن میرا

صورتِ ابر برستے رہیں بازو تیرے
آگ کی طرح دہکتا رہے گلشن میرا

تم جہاں جرمِ ضعیفی کی سزا پاتے ہو
اسی سیارے پہ موجود ہے بچپن میرا

***

تراش لی ہے زمیں ماہ وتاب سے میں نے
زبان سیکھی ہے اُم الکتاب سے میں نے

بہارِ لالہ ونسرین دیکھنے کے لیے
قدم نکالا جہانِ خراب سے میں نے

نگار خانۂ ہستی عجیب مستی ہے
کہ ہاتھ کھینچ لیا ہے شراب سے میں نے

یہ بست وبندِ مسرت مجھے پسند آیا
چنا ہے پھول ردائے چناب سے میں نے

خدا گواہ کہ اک اور آب کی خاطر
بچا لیا ہے مکاں سیلِ آب سے میں نے
***

آسمانِ نیلگوں کو دیکھتا ہے پر کشادہ
آدمِ خاکی کے دل میں شوق ہے حد سے زیادہ

باغ دہکایا ہوا ہے، ابر سا چھایا ہوا ہے
دو بدن یک جا ہوئے ہیں بر بنائے شامِ وعدہ

پھوار پڑتی ہے چمن پر، یاسمین و نسترن پر
ایک فوارے کے نیچے خواہشیں ہیں بے لبادہ

روشنی ہلکی گلابی، نیند میں چہرہ کتابی
کاغذی قندیل تھامے دیکھتا ہے شاہ زادہ

صبحِ آب و گل کی جانب، شہرِ مستقبل کی جانب
توڑ کر زنجیرِ جادہ، چل دیا ہوں پا پیادہ

شہر کی آوارہ گردی اور شغلِ شعر گوئی
کیسے رہ سکتا ہے کوئی بے نیازِ ابر و بادہ

واسطہ ہے میرا ثروتؔ داستانوں سے برابر
ان خزانوں سے برابر کر رہا ہوں استفادہ
***

رقصِ سیارگاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کہکشاں کے ہم بھی ہیں

روئے شہزادگاں پر اک موسم
شہرِ جنت نشاں کے ہم بھی ہیں

اک طلسمِ بہار ہے دائم
باغباں گلستاں کے ہم بھی ہیں

رفتۂ رنگِ آسمانی ہیں
سحرِ آبِ رواں کے ہم بھی ہیں

گردشوں میں ہزار سیارے
قائل اس خاک داں کے ہم بھی ہیں

اور بھی لوگ جل رہے ہیں یہاں
ساتھ اس نوجواں کے ہم بھی ہیں
***

حکمِ آوار گی بجالایا
راہر و تھا صدائے پالایا

برگِ بے اختیار تھا میں بھی
اک سمندر مجھے بہالایا

دامنِ دل میں اور کیالاتا
آگ تھی، آگ ہی لگالایا

جی بہلتا نہیں کسی صورت
سیرِ بازار بھی دکھالایا
***

اک کائنات ٹوٹ کے دوبارہ بن گئی
بعد از چراغ، تیر گی نظارہ بن گئی

فرشِ زمیں پہ بالش و بستر سے بے نیاز
میں آسمان اور وہ سیّارہ بن گئی

وہ کون تھی جو میرے اندھیرے کے سامنے
پتھر سے آگ، آگ سے فوارہ بن گئی

***

شبِ سجود مری اور نہ اعتکاف مرا
بس ایک شمع کے چو گرد ہے طواف مرا

مرے چراغ کی پیکار آسمان سے ہے
زمین تجھ سے نہیں کوئی اختلاف مرا

اُتر رہی ہیں رخِ ماہ تاب سے پریاں
لرز رہا ہے اندھیرے میں کوہِ قاف مرا

***

پرندے، چراغ اور پھول اور بادل، زمیں چل رہی ہے
سمندر مجھے بھی بہائے لیے چل، زمیں چل رہی ہے

نمودار و ناپید کی منزلوں سے گزرتے مناظر
اساطیر، آبادیاں اور جنگل، زمیں چل رہی ہے

صدا اور خاموشیوں کے تصرّف میں اک آبگینہ
اور اس آبگینے کے اندر مسلسل زمیں چل رہی ہے

***

میری دیواروں کے اندر عمر بھر موجود ہو
صوفیہ تم آگ ہو اور خاک پر موجود ہو

اس سے پہلے جو بھی ڈر تھا راکھ ہونا ہے اُسے
خوف کیسا، میری بانہوں میں اگر موجود ہو

میں نے اے وحشی پرندے نام رکھا ہے ترا
کس لیے یہ سرگرانی جب شجر موجود ہو

اپنی دونوں چوٹیوں کو کھول دو اور ساتھ آؤ
کس لیے ٹھہرے رہیں ہم، جب سفر موجود ہو

***

اسی زمین پر ایک ختن ہے جس میں اک آہو رہتا ہے

جس کے ہونٹ پہ تل ہے، ثروتؔ آنکھوں میں جادو رہتا ہے

پھر وہ لڑکا ان آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب گیا تھا
بیس برس کی حیرانی میں کب دل پر قابو رہتا ہے

اس کے ہجر میں مر سکتا ہوں، اس کو قتل بھی کر سکتا ہوں
میری ہر چاہت میں شامل نفرت کا پہلو رہتا ہے

باغ سے باہر ریگستان اور گرم ہواؤں کے لشکر ہیں
باغ کی دیواروں کے اندر موسمِ ابر و سبو رہتا ہے

وہ بھی دن تھے اس کی خاطر جمع کیے تھے پھول اور آنسو
اب تو ان ہاتھوں میں ثروتؔ کھلا ہوا چاقو رہتا ہے
***

عورت، خوشبو اور نمازیں، اب ہے یہی معمول مرا
اس شہد یلے سیارے پر میں ہوں اور رسولؐ مرا

کوئی بھی رُت ہو، میں موجود ہوں ریگستان کے آخر پر

گرم ہواؤں کے جھکڑ میں کھل اٹھتا ہے ببول مرا

تم نے اک شاعر کو لڑکی، اتنی دیر اداس رکھا
لوٹا دو اس کے آئینے، واپس کر دو پھول مرا

کہاں کہاں کے باشندوں نے میرے گرد ہجوم کیا
پانی کیسی کشش رکھتا ہے دیکھو شوقِ فضول مرا

باغیچے کے ٹھنڈے فرش پہ ہم دونوں پیوست ہوے
تیز ابلتی روشنیوں میں سایہ تھا معزول مرا
***

جب تک سورج سر رہے
باقی یہ منظر رہے

بادل بھیجے آسماں
دامن تیرا بھر رہے

پیروں نیچے چاندنی

سر اوپر چھپّر رہے

محنت اپنے کام میں
وارفتہ دن بھر رہے

ٹھنڈی میٹھی نیند کو
ہریالی بستر رہے

یہ چھوٹی سی جھونپڑی
سیاروں کا گھر رہے

دریاؤں کی دوستی
دائم صورت گر رہے

زرخیزی کا ذائقہ
مٹّی کو ازبر رہے

نور ظہور بہار کا
پتّی پتّی پر رہے

***

نہیں آتی ثروت وہ پہچان میں
یہی اک کمی ہے پرستان میں

ہمارے لیے اس نے دو ماہتاب
چھپا کر رکھے ہیں گریبان میں

گناہوں کی قندیل رکھ لیجیے
اندھیرا بہت ہے بیابان میں

کوئی دامِ بلقیس ہے چار سو
بھٹکتا ہوں خوابِ سلیمان میں

یہ دن رات جشنِ بہاراں کے ہیں
ملو اس سے جا کر گلستان میں

محبت سے دبکی ہوئی شیرنی
ابھی سو رہی ہے نیستان میں

مگر آدمی اب بھی محصور ہے
اسی خوابِ انجیر و یک نان میں
***

اس طا قچے پہ تیغ و علم خوش نما نہیں
میدانِ کارزار سے رَم خوش نما نہیں

جھونکے گزر رہے ہیں جلاتے ہوے مجھے
اُس کے بغیر باغِ ارم خوش نما نہیں

اک شیرنی کو سوئے ہوے دیکھتا ہوں میں
اس سے زیادہ کوئی صنم خوش نما نہیں

ان گیسوؤں کی چھاؤں میں ٹھنڈک عجیب ہے
یہ سائبان دھوپ سے کم خوش نما نہیں

اے دخترِ فراعنہ، ثروتؔ سے آکے مل
"حد سے زیادہ جور و ستم خوش نما نہیں"

***

میں حجلۂ شہناز پہ تاخیر سے پہنچا
یہ زخم مجھے اپنی ہی شمشیر سے پہنچا

کب خامشیِ یار سے پہنچا تھا کوئی رنج
جو شور مچاتی ہوئی تصویر سے پہنچا

یہ سلسلۂ عشق جو پہنچا ہے یہاں تک
عشاق کی لکھی ہوئی تحریر سے پہنچا

میں اپنی شکستوں پہ پریشاں تھا کہ اُس دم
پیغام کوئی بارگہِ میر سے پہنچا

ثروتؔ مری تنہائی کا نابینا کبوتر
اس بام تلک کون سی تدبیر سے پہنچا
***

خوابوں میں وہ لوگ زندہ تر ہیں

آنکھیں نہیں، رفتگاں کے گھر ہیں

شبنم ہے نہ شاخ، نَے ستارہ
سب اپنی نگاہ کے بھنور ہیں

میں اُن سے ضرور جا ملوں گا
صبحیں مری منتظر اگر ہیں

مٹی کی اس انتظار گہ میں
آدم ہے، شجر ہیں، جانور ہیں

بچپن ہے بہشت کا کنارہ
ہم جس کی جھلک سے نغمہ گر ہیں

***

بہار آسا ہوئیں شاخیں، نئے پتے نکل آئے
تھرکنے کے لیے مٹی پہ رقاصِ ازل آئے

عجب تقسیم ہے لیکن خدا کو زیب دیتی ہے

مرے حصے میں پانی، اس کے حصے میں کنول آئے

عجب انداز سے دیکھا کسی نے میرے تارے کو
مجھے تو یوں لگا جیسے کہ بال و پر نکل آئے

بہت سے رنج ہیں جو بے ارادہ کھینچتا ہوں میں
کسی پہلو تو چین آئے، کسی کروٹ تو کل آئے

سرِ شام و سحر میں منتظر ہوں اس بلاوے کا
نہ جانے کس طرف سے، کب وہ پیغامِ اجل آئے
***

تندیِ آب و ہوا پر دھیان دینا چاہیے
دوستو، شورِ درا پر دھیان دینا چاہیے

سبزۂ خودرو کی بانہیں کس لیے بیتاب ہیں
اس وفورِ خوش نما پر دھیان دینا چاہیے

کام لینا چاہیے آدم کو غور و فکر سے

یعنی اس حیرت سرا پر دھیان دینا چاہیے

بام و در سے بے نیازانہ گزرا اچھا نہیں
کچھ تو انداز و ادا پر دھیان دینا چاہیے

آسمانوں سے اُدھر کوئی اگر ہے تو اُسے
آدمی کی التجا پر دھیان دینا چاہیے

ہم اسی مٹی کی پیداوار ہیں ثروت ہمیں
سرزمینِ مبتلا پر دھیان دینا چاہیے
***

مری صفوں کو پریشان کیوں نہیں کرتا
غنیم جنگ کا اعلان کیوں نہیں کرتا

کھلی فضاؤں میں نشّہ عجیب نشّہ ہے
ہجوم قصدِ بیابان کیوں نہیں کرتا

خروش رکھتا ہے دریاے دل اگر لوگو

تو پھر تہیّۂ طوفان کیوں نہیں کرتا

کھلیں گے زیست کے اسرار ہائے سربستہ
فرشتہ سیرِ پرستان کیوں نہیں کرتا

غزالِ تشنہ بھٹکتا ہے کس جہنّم میں
کنارِ آب سے پیمان کیوں نہیں کرتا

دلِ تباہ اگر ہے نجات کا طالب
تو وردِ سورۂ رحمٰن کیوں نہیں کرتا

یہ کوہسار، یہ گلشن، نجوم و شمس و قمر
ان آیتوں پہ کوئی دھیان کیوں نہیں کرتا

محمدؐ عربی کی مثال کو ثروتؔ
کتابِ زیست کا عنوان کیوں نہیں کرتا
***

اپنے ہونے پہ پیار آتا ہے

اور بے اختیار آتا ہے

اے غزالِ ختن تری جانب
کوئی دیوانہ وار آتا ہے

ایک طاؤس نے کہا مجھ سے
موسمِ صد بہار آتا ہے

دیدہ و دل میں کر رکھو محفوظ
یہ سماں ایک بار آتا ہے

دیکھیے آج رونقِ عکاظ
کوئی ناقہ سوار آتا ہے

میں کسی کا نہیں، اُسی کا ہوں
کب اُسے اعتبار آتا ہے
***

وہ سرِ بام کیوں نہیں آتا

ڈھل گئی شام، کیوں نہیں آتا

حجرۂ ذات میں ہے کیوں رُوپوش
بر سرِ عام کیوں نہیں آتا

طائرِ سرخ سے کبھی پوچھوں
وہ تہہِ دام کیوں نہیں آتا

اب تو وہ شخص بھی میسر ہے
دل کو آرام کیوں نہیں آتا

کیا ہے اندھیر میکدے والو!
مجھ تلک جام کیوں نہیں آتا

میرا سکّہ کھرا ہے گر ثروتؔ
پھر کسی کام کیوں نہیں آتا
***

حیران ہیں کیوں مدِ مقابل نہیں آیا

ہم راہ میں بیٹھے رہے، قاتل نہیں آیا

رنگینیِ باغات سے اس بار جو گزرا
کانوں میں مرے شورِ عنادل نہیں آیا

کیوں سو گیا عشاق کی تلوار کو رکھ کر
اس شہر میں تجھ سا کوئی بزدل نہیں آیا

ڈوبی ہوئی چیزوں پہ گزرتا رہا پانی
غرقاب ہوے لوگ، پہ ساحل نہیں آیا

بے مہریِ موسم کا گلہ کیجیے کس سے
حصے میں مرے شوق کا حاصل نہیں آیا

کم بختیِ دل راہ سجھائے کوئی ثروتؔ
میری یہی مشکل ہے کہ مشکل نہیں آیا
***

انساں کی خوشی کا استعارہ

رکھا ہے زمین پر ستارا

الجھاؤ بہت ہے زندگی میں
کچھ ہوش سے کام لے خدارا

بہتے ہیں چراغ اور بادل
کیا خوب ہے زندگی کا دھارا

اس نے نہ کبھی پلٹ کے دیکھا
میں نے تو اُسے بہت پکارا

تھی شامِ سفر، پری کی خاطر
میں نے بھی شفق سے گل اتارا

مٹی کی دھنک بتا رہی ہے
گزرا تھا ادھر سے ابر پارہ
***

دستِ دیوانگی میں پتھر ہیں

جیب و داماں خون سے تر ہیں

ادب آداب اُٹھ گئے شاید
سب کے سب آدمی کھلے سر ہیں

بیچ میں باغ ہے محبت کا
اور اطراف میں کھلے در ہیں

دیدہ و دل میں کیجیے محفوظ
یہ مقامات روح پرور ہیں

نہیں چلنا بھی ایک چلنا ہے
راستے آدمی کے اندر ہیں

میں پیمبر نہیں مگر مجھ کو
کاتبانِ وحی میسر ہیں
***

تیز چلنے لگی ہوا مجھ میں

کوئی پتے گرا رہا مجھ میں

اے مرے اندروں، بتا کچھ تو
کیا خداوند ہے چھپا مجھ میں

میں دھنک اوڑھ کر نکلتا ہوں
پھول ہے ایک خوش نما مجھ میں

! میں عجب شہسوار ہوں لوگو
نینوا مجھ میں، قرطبہ مجھ میں

دوستو اب نہیں رہا باقی
حوصلہ امتحان کا مجھ میں

یہ طلوع و غروب کے منظر
ابتدا مجھ میں، انتہا مجھ میں
***

عہدِ ستم تمام ہو، لوگوں کو سکھ ملے

ایسا کوئی نظام ہو، لوگوں کو سکھ ملے

عشاق نے چراغ جلائے ہیں اس لیے
انسانیت کا نام ہو، لوگوں کو سکھ ملے

الفت کا پھول رنگ بکھیرے ابد تلک
نفرت خیالِ خام ہو، لوگوں کو سکھ ملے

کب تک رہیں گے خوار کھلے آسماں تلے
دیوار و سقف و بام ہو، لوگوں کو سکھ ملے

تاراج کر کے رکھ دیا ساری زمین کو
اب اس کا اختتام ہو، لوگوں کو سکھ ملے

اس سے زیادہ اور نہیں چاہیے ہمیں
آدم کا احترام ہو، لوگوں کو سکھ ملے
***

گلاب لے کے آئیں گے، سحاب لے کے آئیں گے

گئے ہوئے وہ نوجواں جواب لے کے آئیں گے

مفاہمت سے دور ہیں ہمارے انتظار کش
زمین پر ضرور انقلاب لے کے آئیں گے

وہ جس میں درج ہے تری قیامتوں کا تذکرہ
ترے حضور ہم وہی کتاب لے کے آئیں گے
***

دھرتی نے دامن پھیلایا
ہوا چلی اور میں زخمایا

ست رنگے باغات سمیٹے
کون یہ میرے سامنے آیا

شاید یہ تہوار کا دن ہے
سنکھ بجے، پرچم لہرایا

ایک چراغ محبت والا

بلھے شاہ سے مجھ تک آیا

ایک الف درکار ہے ثروتؔ
تختی لکھ کر بھید یہ پایا

***

انگور کی بیلوں تلے
اے یار، لگ جاؤ گلے

امروز سے آئندہ تک
دل کا چمن پھولے پھلے

آوارگی کی راہ میں
آئے ہیں کیا کیا مرحلے

دیکھو ہوائے تُند میں
امید کا دیوا جلے

ثروتؔ تری دہلیز تک

آیا ہے کوئی دن ڈھلے

***

سرِ کوے بتاں حیران کن ہے
محبت کی اذاں حیران کن ہے

ہواؤں سے گزرتے ہیں پرندے
یہ گلشن، باغباں، حیران کن ہے

سحر دم بادباں کا چاک ہونا
سرِ آبِ رواں حیران کن ہے

فرشتوں نے کہا حیران ہو کر
بشر کا خاک داں حیران کن ہے

ادائے شعلگی کہتی ہے ثروتؔ
قبائے جسم و جاں حیران کن ہے

***

گل و گیاہ سے میں استفادہ کیا کرتا
ترے بغیر چمن کا ارادہ کیا کرتا

ترے حضور گزرنا تھا دشت و دریا سے
ترے غیاب میں تسخیرِ جادہ کیا کرتا

دِشائیں ٹوٹ رہی تھیں شجر کی شاخوں میں
پرندہ اپنے پروں کو کشادہ کیا کرتا

سفر کی خاک ہی میرا لباس تھی ثروتؔ
اتار کر میں شکستہ لبادہ کیا کرتا
***

حمد

پرستش کے پودے کو سینچا ہے میں نے
لہو سے، لہو سے گزرتی ہوئی آب جو سے
مری آبیاری سے روشن ہوے ہیں
گلابی شگوفے، پرستش کی خوشبو

کو پایا ہے میں نے، نہایت کے
اجلے افق پر پرندے، پرستش کے
پودے کے اطراف ایسے اترے ہیں
... جیسے فرشتے
***

شگفت... ایک حمد

اک اک کر کے تارے شاخِ شجر پر کھل اٹھتے ہیں
جیسے سات فلک کے سیاروں پر دھوپ چمکتی ہے
دھوپ جو ہر دم پر تولے آغاز و انجام سے بے پروا گردش میں رہتی ہے
گردش جو خود اک سیارہ ہے کبھی نہ تھکنے والا
کبھی نہ تھکنے والے سیارے کو میرا نیک سلام
نیک سلام اسی کی جانب جو سیاروں کا مالک ہے
مالک ازل کے دن کا اور ابد کے تہہ خانے کا،
... کھل اٹھنے پر سارے پھول اور سارے منظر ایک ہی سورج کے پرتو سے روشن
***

آدمی...ایک حمد

آدمی ایک حمد ہے، حمد کے اُس طرف ہے کیا
حمد کے اُس طرف ہے نور، جو ہے زمیں پہ موج زن

جو ہے زمیں پہ موج زن، وہ ہے فلک پہ چار سُو
اور یہاں مرے قدم اُس کے خیال میں سدا

روشنیوں کے بھید ہیں، آدمی ایک حمد ہے
حمد کا گھر ہے آدمی، آدمی نُور کا سرا

***

چراغ...ایک حمد

چراغ ایک حمد ہے، چراغ ایک گیت ہے
چراغ کا یہ گیت ہی ازل کا انتظار ہے

ازل کے انتظار سے ابد کی ڈور کا سرا
بندھا ہوا ہے دیر سے، خدا کے حکمِ خاص پر

خدا کے حکمِ خاص پر چراغ ایک حمد ہے

***

درخت...ایک حمد

درخت پانی کو چھو رہا ہے
سیاہ مٹی کے آئنے میں

اسی کا چہرہ بنا ہوا ہے
اسی کا چہرہ جو بے صدا ہے
ؕ

***

خودکشی کا فرشتہ

(صادق ہدایت)

وہ بوفِ کور، بہت دور
آشیانے میں تلاش کرتا ہے

اس موت کو جو آنی ہے

عجب کہانی ہے

!مگر سنو ٹھہرو

کہیں وہ موت ہمارے ہی درمیاں تو نہیں

***

خودکشی کا فرشتہ

(شکیب جلالی)

کالی ریل کی پٹری پر

شہزادے کی لاش پڑی

آنکھوں میں اشکوں کی جھڑی

جیسے بارش آوارہ ہو

سیّارہ ہو

جو خون میں ڈُھل کر نکلا ہو

***

خودکشی کا فرشتہ + محبت کا فرشتہ

(سعید کے واسطے)

: تم نے لوہے کے پُل سے دریا کو دیکھا
ناراض، غصیلا چنگھاڑتا پانی
میں نے کشتی سے دریا کو دیکھا
اور چلو بھر گیت اٹھا لیے
***

ابدیت کا فرشتہ

ہری سلاخیں
ہری ہوائیں
ہرے احاطے
ہرے پرندے
ہری گھنٹیاں
ہرا فرشتہ
ہری موت اور ہری زندگی
***

شکستہ پر فرشتہ

شکستہ پر فرشتہ اپنے پر کو ڈھونڈتا ہے، رات کالی ہے
کسی حبشی کی صورت طوفِ کعبہ میں مگن پیہم، ابابیلوں
سے پوچھو: کس جگہ ہے پر فرشتے کا، کسی آئینے پر یا
کنویں کے زرد پانی میں، کسی بچے کی آنکھوں میں، کوئی
دریا بہا کر لے گیا یا رات کا بادل ستارہ
دین و دانش کا، انڈیلے ارغوانی مے، پیے اور جھومتا
جائے، بہشتِ باغ میں فوارے کے آنسو نکل آئے
***

اے کارو نجھر

اے کارو نجھر تو معبد ہے
میں پاندھی چل کر آتا ہوں

گیتوں سے ہلکا کوئی نہیں
گیتوں میں ڈھل کر آتا ہوں

اے کارو نجھر، اے کارو نجھر

تری روپا میں سو رنگ بہیں

ترے مور مویشی اور پکھّی
تری بھٹیانی کے سنگ رہیں

اے کارونجھر اے کارونجھر
ترا سینہ رازوں کا مسکن

ترے بازو چاہت کے بندھن
آنکھوں میں سانجھ سویر لیے

اور پھولوں بھری چنگیر لیے
میں آتا ہوں، میں آتا ہوں

اے کارونجھر، اے کارونجھر
***

کارونجھر
(اظہر نیاز کے نام)

تھر کے ریگستان میں رنگوں کی بوچھار ہے
موروں کی جھنگار ہے
موروں کی جھنگار میں رقص کا بلاوا ہے
رقص کے بلاوے میں مورنی کی پکار ہے
میرے دل کی مٹی کو کارونجھر سے پیار ہے
***

مور پنکھ

اے مور پنکھ
تو موءِ قلم
تختی مجھے درکار ہے
چاروں طرف
رنگوں کا اک تہوار ہے
بوچھار ہے
بوچھار میں دو پھول ہیں
اک پھول جوڑے کے لیے
اک سبز پانی کے لیے

***

چلنا

چلنا دھوپ میں چلنا
دھوپ میں ننگے پیر چلنا
تپتی ہوئی زمیں پر دھوپ میں ننگے پیر چلنا
بنا کسی چھتری کے
بنا کسی یاد کے
جال کاندھے پر دھرے
موت کی سیدھ میں
***

گیت

اُن ہونٹوں پر
اِن ہونٹوں پر
یہ گیت کہاں سے آتے ہیں
یہ پھول جہاں سے آتے ہیں

بن پھلواری میرا من ہے
من درپن ہے
اس درپن میں
ٹھنڈا جھونکا
گیت سنائے
اُن ہونٹوں پر
اِن ہونٹوں پر
یہ گیت کہاں سے آتے ہیں
یہ پھول جہاں سے آتے ہیں
بادل بن اُڑ جانے والے
لوگ ہمارے
اپنے پیارے
اُن ہونٹوں پر
اِن ہونٹوں پر
یہ گیت کہاں سے آتے ہیں
یہ پھول جہاں سے آتے ہیں
تتلی کے رنگین پروں پر
دھوپ ہے کیسی
روپ ہے کیسا

انگنائی کا

تنہائی کا

اُن ہونٹوں پر

اِن ہونٹوں پر

یہ گیت کہاں سے آتے ہیں

یہ پھول جہاں سے آتے ہیں

***

نیند سے پہلے

گوءُدھول سمے تم یاد آئے

جب شام کا پہلا تارا

دُور آکاش پہ چمکا

اور مرا دل ایک دیے کی صورت جل اُٹھا

تم یاد آئے

مٹّی کے اک کوزے پر

پتّوں کا گرنا

اور بچوں کا شور مچانا

گیلی مٹی پر
اک پھول بنانا
اور لوٹ آنا
اپنی چوکھٹ پر
اور ماں کی آنکھوں میں
شام کے تارے کو پانا
اور سو جانا
***

کھیت

ہوا میں لہلہاتے، سانس لیتے بادلوں، آبادیوں
کو دیکھتے، سنتے، سناتے، مینڈھ پر چلتے ہوئے بچے کی
آنکھیں طائروں کو دیکھتی ہیں، سوچتی ہیں، ابتدا کا
بیج کیا تھا، کون سی مٹی میں وہ بویا گیا، کھویا گیا تھا
پھول، پتے اور شاخیں اور جڑوں کی انگلیاں مٹی کے
گہراؤ کو چھوتی
سات رنگی چھتریوں کو ہاتھ میں تھامے گزرتا ہے جلوسِ جاودانی
اور پانی پتھروں کو کاٹتا، تحریر کرتا آفرینش کی کہانی

***

جھیل من چھر

پکشی آئے دور سے، تن من نیل و نیل
پھر بھی ایک سبیل، آب کٹورا جھیل کی

آب کٹورا جھیل پر، صدیوں سے آباد
بستی دور افتاد، ازل ابد کے سامنے

ماہی گیر کی تان، سورج کی لالان
محنت کش انسان، رزق تلاشیں آب میں

ہنسوں کی پہچان، اجلے برف سمان
جیسے چپ انسان، حیرانی میں غرق ہو

اے میری من چھر، تیرے کشتی گھر
پانی کے اوپر، شاد آباد رہیں

پکشی لایا چونچ میں، اک برگِ زیتون
ثروت نیک شگون، اس جلتے شمشان میں
***

گھوڑے کا قصیدہ

گھوڑے تیری آنکھوں میں
دو جلتے انگارے ہیں
رنگوں کے فوارے ہیں
فوارے کے چھینٹوں سے
کل عالم گلزاری ہے
گاڑی تجھ پر بھاری ہے
جنگل تیرے سپنے میں
لذت ایک تڑپنے میں
تیرے نعل کی چنگاری
مجھ کو پھول سے ہے پیاری
گھوڑے تیری زنجیریں
مٹی کا سینہ چیریں
مٹی اندر پانی ہے

سب کی ایک کہانی ہے

***

پتھر کی دیوار میں ایک کھڑکی

(انوپا کے لیے)

اس نے پتھر کی دیوار میں ایک کھڑکی بنائی
اس میں پانی کا ایک کوزہ رکھا
اور باجرے کے دانے بکھیر دیے
اُس نے کھڑکی بنائی پرندوں کے لیے
اور دیکھنے کے لیے کہ باہر کا جنگل کیسا ہے
کیاآسمان پہلے کی طرح گنجان ہے
اس نے کھڑکی بنائی
کہ ہوائیں اپنے ساتھ گیت لا سکیں
اس نے کھڑکی بنائی
اور اپنے زخمی ہاتھوں کو دیکھا
اس نے کھڑکی بنائی
کہ کوئی موسم آئے اور کہے:
تم اتنی دکھی کیوں ہو

تمھارے ہاتھ دھودوں

تمھارے بال سنواروں

اس نے کھڑکی بنائی

کہ اس کی دعا چڑیوں کے ساتھ

پرواز کر سکے اور کوزے کے پانی پر لوٹ سکے

اس نے کھڑکی بنائی

کہ جواب آنے تک وہ زندہ رہے

سو کھڑکی کھلی رہے گی

اور ہاتھ خون آلود رہیں گے...

***

بھگون بیلی

ہری ہری بیلوں میں لال لال پھول ہیں

لال لال پھولوں میں پھولوں کے بیج ہیں

پھولوں کے بیج بھی اندر سے باغ ہیں

گھنی گھنی راتوں میں مٹی کے چراغ ہیں

مٹی کے چراغوں کو پوَن کیا بجھائے گی
روشنی کی برکھا میں نیند ڈوب جائے گی

سپنوں کے پھولوں میں بھگون بیلی ہے
اتنے بڑے باغ میں کب سے اکیلی ہے

پت جھڑ کی اوٹ سے خواب یہ دکھایا ہے
بیج بونے والے نے آسماں بنایا ہے
***

آنکھیں

جب میں نے پہلی بار آنکھ کھولی
تو میں نے دو آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پایا
اذان کی آواز سے پہلے پیار کا اک میٹھا بول سنا
یہ میری ماں کی آواز تھی
پھر مجھے گہری نیند آ گئی
جب میری آنکھ کھلی تو سامنے
دو خوب صورت آنکھیں تھیں

سمندر کی طرح گہری

اور ستاروں کی طرح بہت قریب

مجھے ان آنکھوں میں اپنا چہرہ دکھائی دیا

پھر یہ آنکھیں مجھ سے اوجھل ہو گئیں

میں روٹی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا

اور آئنوں، جھیلوں اور دریاؤں میں

ان آنکھوں کو ڈھونڈتا رہا جو مجھ سے کھو گئی تھیں

***

خیاباں خیاباں ارم

(بہاریہ)

گلِ محمدّی:

کیسے تمہید گلِ تر لکھوں!

سارے عالم کو جزیرہ ٹھہراؤں

ایک انساں کو سمندر لکھوں

گلِ داؤدی:

زبور کی ان لکھی عبارت

سپید مٹی کی اک عمارت

سفر گہہِ خاک کی زیارت

: گلِ آب

دشتِ ناپیدا کنار

دُور بگلوں کی قطار

اک پیمبر سوگ وار

: گلِ عباس

ایک نارنجی ہنسی

ایک زخمِ مندمل

آشنائے آب و گِل

: گلِ دوپہر

میرا سکوت اور کلام

اُس گلِ دوپہر کے نام

جو مرے خواب میں کھلا

اور مجھے نہیں ملا

: گلِ کاغذی

قیدی کسی گل دان کے

پتھر کسی میدان کے

لکھے ہوئے انسان کے

: گلِ مرگ

چہرہ کسی چنگیز کا
ایک وار تیغِ تیز کا
***

شاعری کا پرندہ

باغ کے اک گوشۂ تنہائی میں میری طرح
آب وخاک و باد کی یک جائی میں میری طرح
منہمک ہے قافیہ پیمائی میں میری طرح
***

ابھی تو میسر مجھے بال و پر ہیں

ابھی تو میسر مجھے بال و پر ہیں
کھلے جابجا باد و باراں کے در ہیں

پروں کی سکت آزمانی ہے مجھ کو
محبت کے اک زمزمے کے علاوہ

پس انداز کچھ بھی نہیں کر سکا ہوں
تجھے سونپنے کے لیے اے پرندے!

لہو کی روانی کا قصّہ ہے باقی
ابھی عمر کا ایک حصّہ ہے باقی
***

زرینہ بلوچ کے روبرو

آواز کا پرکاش تم
آکاش تم
اے کاش تم
اِک پھول میں زندہ رہو
اِک پھول میں زندہ رہو
***

شاعری کی طرف

شاعری کی طرف کھلتے ہیں مرے دروازے

اور دروازوں کی اُس پار دمکتی دنیا
کھینچتی ہے مرا دامان، چلے بھی آؤ
تنگنائے در و دیوار سے باہر جا کر
میں بھی اطراف و جوانب کی خبر لاؤں گا

***

اوسارو

بزمِ جہاں میں تجھ ایسا دیوانہ کوئی کوئی
محفل سے یوں اُٹھ جانے پر تیری سندھڑی روئی
دلوں میں تیری یاد سلامت حیدر بخش جتوئی

***

تاراس بلبا کے خوابوں میں

تاراس بلبا کے خوابوں میں وحشی درندے کے منھ زور جھکّڑ
بکھرتے ہوئے پھول پتّے، گراں خواب پنجر
حکایت زدہ پانیوں پر اُترتے پرندے، پرانے نئے
آسمانی لبادے، شرابور قریے، گزرتے ہوئے چاند تارے

شرارے فراموش جگہوں سے اٹھتے، سنبھلتے، زدوکوب کی
داستانیں، اڑانیں نمودار ناپید کی منزلوں پر
***

پالنا

خوشبوؤں کا پالنا
دیکھنا بھالنا
ننھے کو اٹھاؤ مت
دور کہیں جاؤ مت
خوشبوؤں کا پالنا

ابو جان آئیں گے
پھول مسکرائیں گے
کاپیاں اٹھاؤ مت
خوشبوؤں کا پالنا
امی کتنی پیاری ہیں
بجو، راج دلاری ہیں
جھولنے سے جاؤ مت

خوشبوؤں کا پالنا

***

وہ وہاں کھڑی ہے

وہ وہاں کھڑی ہے
اپنے پیر مضبوطی سے جمائے
ایک اونچے پتھر پر
جسے صرف میں دیکھ سکتا ہوں
ایک بچے کی طرح دم سادھے... لگاتار
وہ وہاں کیسے پہنچی
کہیں سے کسی پتھر کا کنارا نہیں جھڑا
گھاس اور گیلی زمین پر اس کی آمد کا کوئی نشان نہیں
وہ کسی اور سیارے سے اُتری ہو گی
ٹھیک اس پتھر پر آہستگی اور وقار کے ساتھ
جیسے ایک اڑتا ہوا پر پانی پر گرتا ہے
بے آواز... پُر سکون
وہ وہاں سے جست کرے گی
ایک دن وہ وہاں سے جست کرے گی

... کسی شکار پر
کسی بنفشئی ستارے پر جو اس نے سوچ رکھا ہے
کسی دھڑکتے ہوے دل پر جو اس کے لیے بنایا گیا ہے
ایک ابدی شور یا سناٹا
یا اُس کے بیچ کوئی اور سمندر
... اور ایک تیرتی ہوئی شیرنی
ؕ
***

وصال کی نظم

دو جسم
پیوست اک دوسرے میں
اندھیرے کا بستر
اندھیرے کا سیال بستر
چکاچوند
اور اک آئینہ
آئینے میں سمندر
سمندر میں کشتی

کہیں دور

اک واچ ٹاور کی

بنتی بگڑتی ہوئی

روشنیوں کی لکا چھُپ

اندھیرا

اندھیرے میں پیوست

دو جسم

اک دوسرے میں

***

سُدھ بُدھ

بھکشا پاتر لیے کھڑا ہے

کوس کڑا ہے

گیروا چولا چونک پڑا ہے

بودھی پیڑ کے نیچے ثروتؔ

گیان دھیان کا چوبارہ ہے

جل دھارا ہے

سروم دکھم دکھم کہتا سیّارہ ہے

***

نیند سے باہر

جاگ اٹھتا ہوں کسی آواز پر
تکیے کے نیچے
پھول کچھ رکھے ہوئے ہیں
نیند سے باہر نکل کر
دھوپ نے دروزہ کھولا
جل پری کی آنکھ سے
آنسو نہیں، موتی گرے تھے
دھوپ کے پیراک نے غوطہ لگایا
اور آنسو کھینچ لایا
اینٹ گارے سے بنی پہلی عمارت
کھڑکیوں سے گر رہے ہیں کاغذ رومال جیسے
یا فرشتے سرمئی مٹی پہ اپنے پاؤں دھرتے
سانس روکے دیکھتے ہیں
آدمی کو رقص کرتے

***

بیج میں سوئے ہوئے سُن!

سات رنگوں کا بلاوا، سانس لیتا ہے ہوا میں
طائروں کا رنگ دیکھو، گیت کا آہنگ دیکھو

بانسری کے دائروں میں دل دھڑکتا ہے کسی کا
جوگیوں کے جھونپڑے میں ایک مٹی کا پیالہ

دیر سے رکھا ہوا ہے اور سندھو کے کنارے
منھ اندھیرے، جاگتے جیتے مچھیرے، جال اپنا

پھینکتے ہیں پانیوں پر، گیت بنتے ہیں ازل کا
***

سندھڑی

سندھڑی تیرے باغ پر شاہ لطیف کا ہاتھ
شاہ لطیف کا ہاتھ، جیسے غیب کی بات

جیسے غیب کی بات لائے ایک چراغ
لائے ایک چراغ، اپنا ایک فلک

اپنا ایک فلک، رنگوں کا دربار
رنگوں کا دربار، ایک طلسم عجیب

ایک طلسم عجیب، جس میں دھوپ نہ چھاؤں
جس میں دھوپ نہ چھاؤں، وہ کیسا میدان

وہ کیسا میدان، جس میں ایک سوار
جس میں ایک سوار لایا اپنے ہاتھ میں

لایا اپنے ہاتھ میں، دودھاری تلوار
دودھاری تلوار کیسا رقص کرے

کیسا رقص کرے حیدر کی شمشیر
حیدر کی شمشیر، خیبر کی آواز

خیبر کی آواز، سورج کی پہچان
سورج کی پہچان، آنکھ کے اندر تل

آنکھ کے اندر تل، جس میں اک آکاش
جس میں اک آکاش، کروٹ لیتا دیر سے

کروٹ لیتا دیر سے، اژدر اک منہ زور
اژدر اک منہ زور، کس کے ہاتھ سے دو

کس کے ہاتھ سے دو سیبوں کی تمثال
سیبوں کی تمثال، ایک درخت کا بھید

ایک درخت کا بھید، مٹی کے اسرار
مٹی کے اسرار جانے اک دہقان

جانے اک دہقان، بیج میں کتنے کھیت
بیج میں کتنے کھیت، شاہ لطیف کہے

شاہ لطیف کہے، بیچ میں منظر چار
بیچ میں منظر چار اور اندھیرا ایک

اور اندھیرا ایک سورج کی تصویر
سورج کی تصویر میری آنکھ کے پاس

میری آنکھ کے پاس، ایک دھڑکتا پھول
ایک دھڑکتا پھول میرے دل کا ساز

میرے دل کا ساز، سندھڑی کا ہم راز
سندھڑی کا ہم راز، سچل کا احساس

سچل کا احساس، اجلے پھول کی باس
اجلے پھول کی باس، ٹھنڈے باغ کا گیت

ٹھنڈے باغ کا گیت، پاکستان کی آس
پاکستان کی آس پرچم ایک ہرا

پرچم ایک ہرا، سات فلک کے بیچ

سات فلک کے بیچ، سیہون کا گنبد

سیہون کا گنبد، جس میں ایک اذان
جس میں ایک اذان، یثرب کا آغاز

یثرب کا آغاز، اسماعیل کا حرف
اسماعیل کا حرف، ابّ وجد کا شہر

ابّ وجد کا شہر، الف الحمد خیال
الف الحمد خیال، اشیا کا پاتال

اشیا کا پاتال، جیسے غیب کی بات
جیسے غیب کی بات، شاہ لطیف کا باغ

شاہ لطیف کا باغ، مہکے ماہ و سال
مہکے ماہ و سال، میرا ایک ایاغ

میرا ایک ایاغ، جس میں مئے قدیم
جس میں مئے قدیم، اس رب کی تعظیم

***

کبوتر

چار کبوتر دور کے آئے میرے پاس
آئے میرے پاس چپ چاپ اور اداس

چپ چپ اور اداس دیکھیں چاروں اور
دیکھیں چاروں اور بارش کو منھ زور

بارش کو منھ زور دیکھا ہم نے آج
دیکھا ہم نے آج گرج چمک کا تاج

گرج چمک کا تاج کس کے ہاتھ لگا
کس کے ہاتھ لگا سورج کا پہیا

سورج کا پہیا چاند سے بات کرے
چاند سے بات کرے، اک قندیل دھرے

اک قندیل دھرے گزرا ایک رسولؐ
گزرا ایک رسولؐ دیواروں کی اوٹ

دیواروں کی اوٹ ایک پرانی چوٹ
ایک پرانی چوٹ جس کا گیت قدیم

جس کا گیت قدیم وہ ہے ربِ رحیم
***

دیوی کے حضور

!پُشپا دیوی
آج کی شام مجھے مہکا دے
ساتوں رنگوں میں نہلا دے
ست رنگا بادل برسا دے
میرے مٹی کے برتن میں
!رس ٹپکا دے
!پیاس بجھا دے
!پُشپا دیوی

پیاس بجھادے

مجھ کو بھی اک پھول بنادے

اور کہیں بالوں میں سجادے

***

ہنس اور جھیل

ہنس بتائے کیا، جو کچھ اندر جھیل میں

جو کچھ اندر جھیل میں، اوپر لائے کیا

اوپر لائے کیا، اندر کا آکاش

اندر کا آکاش، گونجے آٹھ پہر

گونجے آٹھ پہر، اس کا نیک قدم

اس کا نیک قدم، مٹی کے مابین

مٹی کے مابین، گندم اور جوار

گندم اور جوار، کھیتوں کا امکان

کھیتوں کا امکان، جیسے بیج میں پھول
جیسے بیج میں پھول، جیسے جسم میں جان

جیسے جسم میں جان، پر تولے ہر آن
پر تولے ہر آن، ایک پرند مہان

ایک پرند مہان، بارش سامنہ زور
بارش سامنہ زور، نکلا ایک سوار

نکلا ایک سوار، اندر کی محراب سے
اندر کی محراب سے، سورج کا سندیس

سورج کا سندیس، جھیل کا پہلا عکس
جھیل کا پہلا عکس، تہہ کا ایک چراغ

تہہ کا ایک چراغ، جاگے اندر جھیل میں
جاگے اندر جھیل میں، رنگوں کا پاتال

رنگوں کا پاتال، اوپر لائے کیا

اوپر لائے کیا، جو کچھ اندر جھیل میں

جو کچھ اندر جھیل میں، ہنس بتائے کیا

***

ہوا

ہوا کی باتیں
میری سمجھ میں آتی ہیں
درختوں کا سکوت مجھ سے کلام کرتا ہے
بارش میرے ساتھ چلتی ہے
اس کے گھر تک
ایک سڑک ہے
سڑک کے دورویہ
پام کے دو پودے ہیں
ایک ناریل کا درخت
اس کے گھر پر جھکا ہوا ہے
ہوا کی باتیں، میری سمجھ میں آتی ہیں

***

بیت

اٹھ باروچہ ! نیند سے، دیکھ جبل کی شان
اوپر سے تو سنگلاخ، اندر سے انسان

اٹھ باروچہ ! نیند سے، گرد زمین کی جھاڑ
نیل و نیل پہاڑ، راہ کسی کی دیکھتے

اٹھ باروچہ ! نیند سے، ست رنگی برسات
ہات میں لے کر ہات، جھوم ناچے زندگی
***

بیت

مٹی ہے رنگین، پانی ہے شفاف
باغوں کے اطراف، جھل مل کرتی بستیاں

اپنا پیار اٹوٹ، باقی سب کچھ جھوٹ

چشمہ نکلا پھوٹ، پتھر کی دیوار سے

تیرے بدیسی پھول، مجھ کو نہیں قبول
کیکر اور ببول، صحراؤں کے رسول
***

بیت

الف احد اکرام، سب سے پہلا نام
جس نے گام بہ گام، پھول بکھیرے دور تک

کیچ ہو یا بھنبھور، پھوٹی پریت کی بھور
کوئی اور نہ چھور، جو ڈوبا سو پا گیا

سونے والے جاگ، سن لہروں کا راگ''
''سلطانی سہاگ، آنکھیں موندے نہ ملے

پڑھ کر شاہ کا بیت، دیکھوں چاروں اور
جل چڑیوں کا شور، ازل ابد کے سامنے

اپنا ملک ملیر، چھوڑوں کیسے ویر
گل برسیں یا تیر، میرا ایک ہی راستا

ڈاچی کی رفتار، چھیڑے دل کے تار
اوپر سے وسکار، گیلا کر گئی ریت کو

اوپر ماہ نجوم، دیکھ دیکھ مت جھوم
اپنی ماٹی چوم، اپنے پھول شمار کر
***

بیت

بادل چھوتی انگلیاں، پیر جمے پاتال پر
مجھ کو میرے حال پر، چھوڑ بھی دے اے سانولی!

کاک بلاوا آگیا، گہرا بادل چھا گیا
رنگوں میں نہلا گیا، مجھ کو مرے استھان پر

کینجھر تا کشمور، بندھی پریت کی ڈور
پھوٹ رہی ہے بھور، باج رہی ہیں گھنٹیاں
***

بیت

کارونجھر کی کور سے، پھوٹ رہی ہے بھور
پانی پر (آ) پہنچے (ہیں)، آدم، پکشی، ڈھور
شور قدیمی شور، دشت جبل میں گونجتا

سدا جلیں او سندھڑی، تیرے چار چراغ
پھولے رنگ بسنت کا، مہکیں تیرے باغ
میرے دل کا داغ، روشن رکھے مامتا

سندھڑی تری سگندھ پر جھوم رہا مالی
سدا رہے یہ کامنا، سدا یہ ہریالی
رنگ بھری ڈالی، جھک آئی دیوار پر

آئندہ کی آس رکھ، اے گھائل انسان

مہکیں گے بر آمدے، آئیں گے مہمان
بدل رہا ہر آن، موسم اپنے آپ کو

ہوا چلے گی اور ہی، بدلیں گے دن رات
شاخ شاخ پر دیکھنا، آئیں گے پھل پات
تیرے خالی ہات، بھر جائیں گے باغباں

سورج کب کا چھپ گیا، باٹ باٹ اندھیاؤ
مت جاؤ بیراگیو، پل دو پل رہ جاؤ
تاپو آگ الاؤ، جو میں نے روشن کیا

جگ مگ جگ مگ انکھڑیاں چہرہ رنگ رتول
خوش بوؤں والی گھڑی ہے یہ ان مول
بند قبا کے کھول، آئی رات سہاگ کی
***

وائی

پریت نبھاؤ تب میں جانوں

سندھو قول و قسم لیتا ہے
اور کوئی دکھیارا شاعر
چھاؤں کے نیچے دم لیتا ہے
چھوڑ کے دنیا بھر کی چیزیں
کاغذ اور قلم لیتا ہے
گُن گاتا ہے اس مٹی کے
جس مٹی سے نم لیتا ہے
***

وائی

دیکھ رہا کیا جنوب شمال
اپنا دیوا آپ ہی بال

کیا کہوں اندر کا حال
ہاتھوں میں بجتی کھڑتال

جس تن لگیا عشق کمال"
"ناچے بے سُر تے بے تال

***

وائی

دور قصور سے مجھ تک آتی
بلّھے شاہ کی روشن باتی

آب کٹورا بھر ا رکھا ہے
تھوڑی سی روٹی مل جاتی

ثروت ایک ندی میں آکر
گرتے ہیں نالے برساتی
***

وائی

تیر کمان میں جوڑ نہ پیارے
لالن لال لطیف پکارے
سارے پرندے ہنس نہیں ہیں

پھول نہیں ہیں آدم سارے
لالن لال لطیف پکارے
سندھ ندی میں چل پڑی کشتی
اوجھل ہو گئے گھاٹ ہمارے
لالن لال لطیف پکارے
تھر مٹی پیاسی کی پیاسی
کارُو نجھر کرتا ہے اشارے
لالن لال لطیف پکارے
***

وائی

نہ ول سائیں تھیو پرے
بادل مجھ میں شور کرے
نہ ول سائیں تھیو پرے
پیپل پتے پرے پرے
نہ ول سائیں تھیو پرے
کیسے کیسے رنگ بھرے
نہ ول سائیں تھیو پرے

کاندھے پر مہتاب دھرے

نہ ول سائیں تھیو پرے

ثروت آکھے بول کھرے

نہ ول سائیں تھیو پرے

***

وائی

سب ساتھی لوٹ کے آئیں گے

تب گائیں گے

جب بادل جل برسائیں گے

تب گائیں گے

باغیچے رنگ جمائیں گے

تب گائیں گے

جل پنچھی شور مچائیں گے

تب گائیں گے

سب سُنجے تھل میں گائیں گے

تب گائیں گے

***

وائی

رنج ہے سب کا اپنا اپنا
میری مٹھّی میں جل سپنا
بیچ سمندر رہ کر میں نے
موجوں سے سیکھا ہے تڑپنا
میری مٹھّی میں جل سپنا
ملاحوں کا کام ہی کیا ہے
ساگر نام کی مالا جپنا
میری مٹھّی میں جل سپنا
دیکھو کونپل پھوٹ رہی ہے
جیسے ہردے بیچ کلپنا
میری مٹھّی میں جل سپنا

***

وائی

پانی کے اوپر

جیسے چمکے ماہ

مجھ میں تیری چاہ

میلوں پھیلے کھیت

سرسوں اور کپاہ

مجھ میں تیری چاہ

پتا ٹوٹے شاخ سے

کس نے سنی کراہ

مجھ میں تیری چاہ

میری آنکھوں میں

تیری نیم نگاہ

مجھ میں تیری چاہ

***

وائی

دیکھا جھل مل آسماں

اٹھ کر آدھی رات کو

کہہ دی دل کی داستاں

اٹھ کر آدھی رات کو

گیت سنائے ساربان

اٹھ کر آدھی رات کو

چلتا جائے کارواں

اٹھ کر آدھی رات کو

***

وائی

جھلملاتا ہے ستارا

پانیوں پر

اپنی کشتی کو اتارا

پانیوں پر

منھ اندھیرے جال ڈارا

پانیوں پر

دھوپ نکلے گی دوبارہ

پانیوں پر

ہم مچھیرے، گھر ہمارا

پانیوں پر

***

وائی

لالن لال لطیف کہے
کچھ تو کارِ ثواب کرو
لالن لال لطیف کہے
ماٹی لال گلاب کرو
لالن لال لطیف کہے
قطرے کو سیلاب کرو
لالن لال لطیف کہے
لکھ لکھ درد کتاب کرو
لالن لال لطیف کہے
***

وائی

پون جھکولے بن پھلواڑی
! اوآرائیں
جیون کانڈیروں کی جھاڑی

! اوآرائیں

تواندر سے تھری نہ لاڑی

! اوآرائیں

بیچ باٹ میں مارنہ تاڑی

! اوآرائیں

اپنی منزل روپاماڑی

! اوآرائیں

ؔ(آرائیں: پھول بیچنے والا)

***

کافی

ویلے کا کوئی نام نہیں ہے

چیت ہو یا بیساکھ

آکھو آکھو آکھ

ماٹی کا کوئی بدل نہ سائیں

سیارے سو لاکھ

آکھو آکھو آکھ

میں تو مست الست ہوا ہوں

ندی کا پانی چاکھ

آکھو آکھو آکھ

ساری رات جلا میں ثروتؔ

پھر بھی ہوا نہ راکھ

آکھو آکھو آکھ

***

کافی

مجھ میں آنکھیں کھول

ہو سندھڑی

مجھ میں آنکھیں کھول

یہ نیلاہٹ کھلے فلک کی

یہ کوّوں کے غول

مجھ میں آنکھیں کھول

پتن پتن چہکار جگائیں

ملاحوں کے بول!

مجھ میں آنکھیں کھول
تہہ کی ساری کتھا سنائے
کنویں پہ رکھا ڈول
مجھ میں آنکھیں کھول
دشت، جبل میں گونج رہا ہے
ایک قدیمی ڈھول
مجھ میں آنکھیں کھول
ہو سندھڑی، مجھ میں آنکھیں کھول
***

کافی

پہلے کوکدی کویل گزری
پھر گزری برسات
میں تے خالی ہاتھ
دو جا شوکدا سپ لہرایا
بن بیلے کے ساتھ
میں تے خالی ہاتھ
کن مِن کن مِن کرتی بوندیں

ہوا سے گرتے پات

میں تے خالی ہاتھ

چلتی، جھاگ اڑاتی لہریں

رُکے ہوئے دیہات

میں تے خالی ہاتھ

***

کافی

یہ گیلے پتے ساون سادے

مجھے نچ کر یار مناون دے

یہ بدلی مجھ تک آون دے

مجھے نچ کر یار مناون دے

ذرا اپنی آگ تپاون دے

مجھے نچ کر یار مناون دے

یہ الجھاوے سلجھاون دے

مجھے نچ کر یار مناون دے

سب قصے آون جاون دے

مجھے نچ کر یار مناون دے

***

کافی

سچا اک کرتار
سہیلی سچا اک کرتار
کیاری کیاری سجا ہوا ہے
رنگوں کا دربار
سہیلی سچا اک کرتار
الجھے دھاگے سلجھاتا ہے
اپنا پالن ہار
سہیلی سچا اک کرتار
پاک پتن گلزاراں ماٹی
دیوے بلدے چار
سہیلی سچا اک کرتار

***

کافی

کچھ نئیں میرے پلے

میں نے چناب کا پانی چکھیا

نیلی چھاں دے تھلّے

کچھ نئیں میرے پلے

اک اک کر کے ٹُر دے جاندے

لو کی کلّم کلے

کچھ نئیں میرے پلے

چار چوفیرے کڑی حیاتی

سنجے گلی، محلے

کچھ نئیں میرے پلے

یا گھنٹی پیتل کی ثروتؔ

یا بھیڑوں کے گلے

کچھ نئیں میرے پلے

***

کافی

الف احد کنارے میں نے

کٹیا ایک بنالی

میں اندر سے خالی

دو جا نبی مبشّر سچا

جس کی کملی کالی

میں اندر سے خالی

دور قصور کی

چمکے جالی

میں اندر سے خالی

الغوزے کی دھن پر ناچے

بالی، بالی، بالی

میں اندر سے خالی

کنک، جوار، مکئی کے دانے

تھالی، تھالی، تھالی

میں اندر سے خالی

***

ثروت حسین کے کلیات کی یہ چوتھی اور آخری پوسٹ اپلوڈ کی جارہی ہے،اس میں ثروت حسین کا غیر مطبوعہ کلام، گوشہ عقیدت اور کالج کے ایام میں ان کی گئی شاعری پر مشتمل ایک مختصر سا مجموعہ نئے دن کا سورج شامل ہیں۔ ثروت حسین کی شاعری اب انٹرنیٹ پر یونی کوڈ میں موجود ہے۔ادبی دنیا نے کوشش کی ہے کہ ایسا معیاری ادب جو کہ بے حد اہم ہو اور جسے لوگ پڑھنا، جاننا چاہتے ہوں اور کتاب کی صورت میں انہیں میسر نہ آپارہا ہو،اس طور مل جائے۔ بہت سے افراد پی ڈی ایف کی بھی خواہش رکھتے ہیں۔ لیکن جب یہ سارا کلام یونی کوڈ میں موجود ہے تو اسے کاپی کر کے کیا بہت آسانی سے ورڈ یا پی ڈی ایف کی شکل میں سیو نہیں کیا جاسکتا؟ مگر کچھ لوگ کاپی، پیسٹ کرنے اور فائل کو پی ڈی ایف میں کنورٹ کرنے جیسی معمولی مشقت سے بھی بچنا چاہتے ہیں۔ خیر ثروت حسین کا کلام آپ پڑھیں اور ہمیں اپنی رائے سے نوازیں۔ ایک بار پھر واضح کرنا ضروری ہے کہ اگر آپ یہ اہم کلام کتاب کی صورت میں حاصل کرنے چاہتے ہوں تو کلیات ثروت حسین آج پبلیشنز کی جانب سے شائع کر دی گئی ہے اور آپ اس سلسلے میں اجمل کمال سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ بے حد شکریہ

غیر مطبوعہ کلام

پھول، پرندے، چراغ اور شجر رقص میں
تو ہے اُدھر رقص میں، میں ہوں اِدھر رقص میں

ناچ رہی ہے زمیں، جھوم رہا ہے فلک
طائرِ نغمہ سرا، دیر نہ کر رقص میں

اور ہی منظر ہے اب، ایک سمندر ہے اب
ٹوٹ گئی ساعتِ علم و خبر رقص میں

اسم نہیں ہے مرا، جسم نہیں ہے مرا
روح کے چو گرد ہے ایک بھنور رقص میں
***

اللہ کی زمیں پر موسم کمال آیا
کچھ پھول آئینے پر میں بھی اُچھال آیا

چمکا تھا ایک تارا بادل کی آستیں پر
شامِ مسافرت میں اس کا خیال آیا

حدِ نظر تلک تھیں جلتی ہوئی دِشائیں
پت جھڑ کی سلطنت میں خوابِ ملال آیا

ثروت گزر رہے ہو آشوب و ابتلا سے
کس کو ملی بلندی، کس کو زوال آیا
(جون 1987، عصر 13)
***

مجھے تو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے
زمیں اپنے خزانے اُچھال دیتی ہے

سنو کہ برف پگھلنے کی صبح آ پہنچی
خبر شمال کی بادِ شمال دیتی ہے

بہار اَب بھی گزرتی ہے اس چمن سے، مگر
ہمیں تو وعدۂ فردا پہ ٹال دیتی ہے

وہ اِک نگہ جو بظاہر نِگاہ سے کم ہے
نگار خانۂ ہستی اُجال دیتی ہے
(جون 1987، مغرب 13)
***

خاک سے چشمۂ صد رنگ اُبلتے دیکھا
میں نے اُس شوخ کو پوشاک بدلتے دیکھا

آتشِ رنگ سے دہکی ہوئی شہزادی کو
ہاتھ میں پھول لیے نیند میں چلتے دیکھا

آگ ہی آگ ہے سیارے پہ لیکن ہم نے
شاخِ زیتون، تجھے پھولتے پھلتے دیکھا

تھی موذن کی ندا، نیند سے بہتر ہے نماز
میں نے پتھر کو مناجات میں ڈھلتے دیکھا

جانیے، کون سی مٹی سے بنے ہیں ثروت
ہم نے عشاق کو دریاؤں پہ چلتے دیکھا
(13 فجر، جون1987)

***

دل انگیزیِ مہر وماہ نہیں جاتی
کس کس آئینے پہ نگاہ نہیں جاتی

آؤ اندھیرے جمع کریں کہ اس درگاہ
روشنیوں والی کوئی راہ نہیں جاتی

کیسی حضوری ہے کہ اُن پرچھائیوں تک
ہو آتا ہے جسم، نگاہ نہیں جاتی

سیرِ دشت کا منظر خوب سہی لیکن
ذہن سے یادِ شہر پناہ نہیں جاتی

پھول پھول سرگوشیاں کرتی تنہائی
سنگ سرشتوں کے ہمراہ نہیں جاتی
***

بدی کی بارش عجیب ہی برگ و بار لائی
نشیبِ خود آگہی کی جانب پکار لائی

فرشتہ ہونے میں دیر تھی کہ گناہ کی شب
زمیں کی آبادیوں میں مجھ کو اتار لائی

اب اس سے آگے سیاہیوں میں سفر رہے گا
یہاں تلک تو رفاقتِ رہ گزار لائی

عجب کشش تھی کہ دل گرفتہ سپاہیوں کو
شکار گہہ میں قطار اندر قطار لائی
***

تو اے اسیرِ مکاں، لامکاں سے دور نہیں (اقبال)

نشیبِ حلقۂ صحنِ مکاں سے دور نہیں
کہیں بھی ہو وہ ستارہ یہاں سے دور نہیں

حدِ سپہر و بیاباں پہ جاگتی ہوئی لو
جو ہم سے دور ہے، آئندگاں سے دور نہیں

گزرنے والی ہے گلیوں سے بادِ برگ آثار
کہ اب وہ صبح مری داستاں سے دور نہیں

اُسی کے حرفِ شگفتہ سے گونجتے در و بام
جو دور رہ کے بھی پہنائے جاں سے دور نہیں

سحاب و سبزۂ نم ناک سے گزرتی ہوئی
یہ شام چشمۂ ریگِ رواں سے دور نہیں

میں اپنے حُجرۂ تاریک تر میں رہ کر بھی
سرشتِ حلقۂ آوارگاں سے دور نہیں

مگر وہ شاخِ تہی رنگ وبستۂ دیوار
جو گلستاں سے الگ ہے خزاں سے دور نہیں

***

آدمی کو رہ دکھانے کے یے موجود ہیں
کچھ ستارے جگمگانے کے لیے موجود ہیں

ابر، دیواریں، سمندر اور نادیدہ افق
رہروؤں کو آزمانے کے لیے موجود ہیں

کیوں گرفتہ دل نظر آتی ہے اے شامِ فراق
ہم جو تیرے ناز اُٹھانے کے لیے موجود ہیں

دیکھتا رہتا ہوں اشیائے تصرف کی طرف
یہ کھلونے ٹوٹ جانے کے لیے موجود ہیں

پیشِ پا افتادہ قریے، سر بر آوردہ شجر
سو بہانے دل لگانے کے لیے موجود ہیں

کون کر سکتا ہے ایسے میں کسی دریا کا رُخ
جب وہ آنکھیں ڈوب جانے کے لیے موجود ہیں

میں درختوں سے مخاطب ہوں خدائے عز و جل
جو زمیں پر سر اُٹھانے کے لیے موجود ہیں
(18 فروری 1990، فجر)
***

مانا کہ گہر نہ ہم نے پائے
پاتال، تری خبر تو لائے

ایسا بھی نہیں کہ ریگِ ساحل
آنکھیں مری راہ میں بچھائے

شاخوں پہ دوبارہ آ گئے پھول
ساتھی جو گئے تو پھر نہ آئے

راتیں اٹھا لائیں بیکرانہ
عرصہ گہہِ خواب کے بجائے

آئینہ چراغ سے ہم آغوش
سورج دبے پاؤں لوٹ جائے

دن چڑھ بھی چکا ہے میرے مہماں
کیسے تجھے میزباں جگائے
***

گھر ہے تو کسی کو سونپتا جاؤں
جاتے ہوئے آگ کیوں لگا جاؤں

دیواروں کو ڈھال تھے مرے ہاتھ
جنگل ہے تو راستہ بنا جاؤں

بانہیں وہ شجر کہ روک لیں راہ
آنکھیں وہ بھنور کہ ڈوبتا جاؤں

نشّہ ہو کسی کی قربتوں کا
ایسا بھی نہیں کہ جو چھپا جاؤں

جاتا ہوں خزاں کی سلطنت کو
تصویرِ بہار کھینچتا جاؤں
***

لرزاں اسی آئینے میں سب ہیں
میں ہوں مرے جاگنے میں سب ہیں

کہتا ہے یہی گزرنے والا
اک میرے سوا مزے میں سب ہیں

یکجا کیا دہشتوں نے آخر
وہ دن ہے کہ معرکے میں سب ہیں

!اے زائرِ صبح کچھ توقف
اس پل تو مراقبے میں سب ہیں

ثروت یہ وصال و ہجر کا گھر
رقصاں اسی دائرے میں سب ہیں
(محمد سلیم الرحمٰن کے لیے)
***

بیت

میں جاؤں جس اور، کارونجھر کی کور
بادل ہے منہ زور، کس تٹ برسے دیکھنا

کارونجھر کی کور، ایک خموش تلاؤ
ایک خموش تلاؤ، اوپر جوڑی ہنس کی

اُوپر جوڑی ہنس کی، نیچے میں اور آسماں
نیچے میں اور آسماں، بیچ میں ایک لکیر

بیچ میں ایک لکیر، سندھو ندی سمان
سندھو ندی سمان، بھاگی مائی کا گیت

بھاگی مائی کا گیت، تھر مٹّی کی بھور
تھر مٹّی کی بھور، اور اک زخمی مور
(مئی1987، عشاء26)
***

پنج آب

اے رِدائے آسمانی
میرے دل میں گونجتا ہے
پانچ دریاؤں کا پانی
(جون1987، فجر15)
***

کافی

الف اگر بتّی سلگائی
ب کی خبر نہ کائی
تختی کیوں دیتا ہے بھائی
ب کی خبر نہ کائی
چھاج پھٹکتی گرم کلائی
ب کی خبر نہ کائی
بَن وِچ کونج کوئی کُرلائی
ب کی خبر نہ لائی
اندر شاخ شگوفے لائی
ب کی خبر نہ کائی
(جون 1987، عشاء 13)

***

زمیں کی انتظار گاہ میں دراز قامتوں کی پیشگوئیوں نے، قطع کلامی کے دانت بہت تیز ہیں، حروف کی سیاہی سوکھنے سے قبل ہی غذائیں کم یاب، فتوحات کی تہوں سے گزرتی خود کار سیڑھیوں پہ سنی گئی خیر مقدمی دُھنوں کی بازگشت، کوئی پیڑ، کسی آدمی کے پیر کا نشاں، مضافاتی بستیوں میں بارودی سرنگوں کے بچھائے ہوے
جال، سوگوار ساحلوں کے الوداعی آثار، حافظے میں شام کے ستارے کا گُمان، کہیں کہیں شاعروں کی خود کلامی کے تجارتی ہوائیں لیے جا رہی ہیں آسمان تیرتے گلاب، لہجوں کی دُرشتگی کے درمیان...

(جولائی 1977 کی آٹھویں صبح)

***

ایک نظم

بتدریج مٹی کی چیزوں پہ گرتی ہوئی ریت کی تازہ کاری، فراموش گاری کی ٹھنڈی ہواؤں میں آنکھیں بہت دور تک دیکھ سکتی نہیں، پیر کے نرم تلووں کے نیچے کسی خشک ندی کا چٹخا ہوا جال، پاتال کی سب کہانی، مگر پیش رو بادلوں تک پہنچنے کی امید میں تیز چلنا ہی ہو گا، مجھے تیز چلنا ہی ہو گا، سیاہی میں تبدیل ہوتی ہوئی آبناؤں، خلیجوں کے پیچاک، نمناک شاموں کی حد پر بھڑکتی ہوئی لالٹینوں کے گھر میں لب بستہ پرچھائیں کو دفن کرتے ہوے ہات، آنکھیں چراغوں سی مدھم... لگاتار اندھیاؤ، پت جھڑ، ہلاکت زدہ بستیوں میں اکیلی سواری، بتدریج مٹی کی چیزوں پہ گرتی ...ہوئی ریت کی تازہ کاری

(جولائی 1977 کی سولھویں صبح)

***

ایک فاتح کا گیت

سنو آہن گر
!مجھے حیرانی سے مت دیکھو
اک کام تمھارے ذمّے ہے
انہی کالے کندٔ ذخیروں سے
تلواروں، زرہوں، زنجیروں سے
اور زہر بجھے ان تیروں سے
کچھ چیزیں تم کو ڈھالنی ہیں

اک لکڑی کاٹنے کی آری
دو گھنٹیاں اور اک ہل کی اَنی
خمدار درانتی کی جوڑی
گلدان منقش اور سادہ
اور ایک کٹورا پانی کا
سنو آہن گر
مجھے حیرانی سے مت دیکھو
(جولائی 1977 کی اٹھارویں صبح)

***

گوشۂ عقیدت

نعت، سلام

آنکھ روشن تھی، دل معطر تھا
لمحۂ مدحتِ پیمبرؐ تھا

آدمی اس بہار سے پہلے
خشت اور خاک کے برابر تھا

ذہن و دل تھے مگر غبار آلود
آئینہ تھا مگر مکدر تھا

اور پھر آمدِ محمدؐ سے
حلقۂ آب و گل معطر تھا

صبح تھی اور خوشبوئے فاراں
شام تھی اور چراغِ منبر تھا

خاک اندازِ سطوتِ کسریٰ
پارہ پارہ شکوہِ قیصر تھا

اک اُسی در سے ہم کو نسبت تھی
اک وہی نام ہم کو از بر تھا
***

کون اس بھید کو پا سکتا ہے
کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

کب وہ یاد سمٹ سکتی ہے
کب وہ نشاں دھندلا سکتا ہے

صدیاں حیرانی میں گم ہیں
کون وہ نام بُھلا سکتا ہے

شامِ ابد کا ایک ستارہ
کتنے چراغ جلا سکتا ہے

اک انسان اسی دنیا کا
کتنی فصیلیں ڈھا سکتا ہے

بپھرے ساگر کی لہروں کو
زنجیریں پہنا سکتا ہے

خار و خس و خاشاک دلوں کے
شعلہ بن کے جلا سکتا ہے
***

رُتوں کی بجتی گھنٹیاں
صدیوں کی گردان

آتے جاتے قافلے
تپتا ریگستان

اوجھل سارے راستے
بوجھل پیر، جوان

لیکن اس اندھیر میں
ایک وہ نخلستان

جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں
سب کو ملے امان
***

مدحتِ ساقیِ کوثر لکھوں
سوچتا ہوں بھلا کیونکر لکھوں

سارے عالم کو جزیرہ ٹھہراؤں
ایک انساں کو سمندر لکھوں

کیوں نہ اس مشعلِ شب تاب کو میں
فکر و احساس کا محور لکھوں

منبعِ مہر و صداقت جانوں
نکہت و نور کا پیکر لکھوں

مختصر یہ کہ میں ان کو ثروت
نوعِ انساں کا مقدر لکھوں
***

پر شکستہ جان طیبہ پر نظر کیسے کرے
یہ کبوتر گنبدِ خضرا میں گھر کیسے کرے
دن گزرتے جا رہے ہیں دیدِ طیبہ کے بغیر
عمر کے یہ ثانیے ثروت بسر کیسے کرے

دل مگر اپنی تمنا مختصر کیسے کرے
***

نئے دن کا سورج
طالب علمی کے دور کا کلام
1968 تا1969

علامہ اقبال کالج کے نام

ثروت حسین

نومبر 21969

کراچی

کچھ ایسے مقامات بھی گزرے ہیں نظر سے
دیکھا کیے اور چپ رہے حالات کے ڈر سے

ہم راہ کی دیوار گرا آئے تھے لیکن
جب دھوپ چڑھی سایۂ دیوار کو ترسے

یہ شعلۂ احساس فروزاں رکھو یارو
او جھل ہے وہ خورشید ابھی حدِ نظر سے

منزل کا تعین ہے نہ راہوں کا پتا ہے
بے سوچے ہوئے آج نکل آئے ہیں گھر سے

احساس اندھیروں کا سمٹ جاتا ہے ثروت
آتی ہے کرن جب بھی کوئی روزنِ در سے

***

ہات آئے کیسے کھوئی ہوئی سوچ کا سرا
کل رات سو گیا تھا یہی سوچتا ہوا

میں دشمنِ وفا کی پذیرائی کے لیے
صحرا کی تیز دھوپ میں پہروں کھڑا رہا

محسوس ہو رہا تھا مرے ساتھ ہے کوئی
دیکھا تو دور دور کوئی دوسرا نہ تھا

اک آپ ہی کو مجھ سے شکایت نہیں فقط
اس طرزِ گفتگو پہ سبھی ہیں چراغ پا

سڑکوں پہ دور تک کوئی آواز بھی نہیں
گزرا ہے میرے شہر پہ کیا کوئی حادثہ

بہتا ہوا چلا تھا میں لہروں کے دوش پر
اور جب ہوا چلی تو کنارے سے جا لگا

***

یار و سمٹ کے جی لیے اب دھوپ کی طرح
اس شہر کی فضا میں بکھر جانا چاہیے

خوابوں کی ناؤ ڈولتی موجوں پہ چھوڑ کر
لمحات کے بھنور میں اتر جانا چاہیے

ہر شخص فاصلوں کی تھکاوٹ سے چور ہے
اب کون یہ بتائے، کدھر جانا چاہیے

ثروت یہ دھوپ اپنا مقدّر سہی مگر
کچھ دیر سائے میں بھی ٹھہر جانا چاہیے
***

آہٹ سی کانوں میں گونجے اور کہیں کھو جائے
آڑی ترچھی پگڈنڈی پر آوازوں کے سائے

آنے والے دن کا سورج اپنی اور بلائے
بیتے دن کے ہنگاموں پر آنسو کون بہائے

شاید اوس میں بھیگی سڑکیں اپنی آنکھیں کھولیں
شاید دروازوں کے لب پر گیت کوئی لہرائے

شہر کی اجلی دیواروں کا چہرہ ہم بھی دیکھیں
موسم کی پہلی بارش سے گرد اگر چھٹ جائے

ذہن کی جھیلوں پر چمکی ہے سچائی کی دھوپ
تیرہ عقائد کی قبروں پر شمعیں کون جلائے

***

اب کوئی بات نئی بات نہیں
اب کسی بات پہ چونکا نہ کرو
میں بھی ہونٹوں کو سیے بیٹھا ہوں
تم بھی اس بات کا چرچا نہ کرو
جانے کیا سوچتی ہوگی دنیا
گھر کی دیواروں پہ لکھا نہ کرو
آج کے دور نے سمجھایا ہے
کبھی تنہائی میں سوچا نہ کرو

بادلو، مجھ پر عنایت کیسی

میری دہلیز پہ سایہ نہ کرو

گھر سے نکلو، ذرا دنیا دیکھو

صرف دروازوں سے جھانکا نہ کرو

ق

دوستو درد زمانے کے تمام

اپنے چہروں پہ سجایا نہ کرو

اور جب درد سجا ہی بیٹھے

آئنہ دیکھ کے رویا نہ کرو

***

کھلے جو بند دریچے تو ایک جھونکے سے

کسی کی یاد کے ہر سو بکھر گئے پتّے

تجھے خبر ہی نہیں اے بہار کے موسم

تری تلاش میں کس کس کے گھر گئے پتّے

زباں تو چپ ہے مگر سوچتی ہیں یہ آنکھیں

وہ پھول کیا ہوے، جانے کدھر گئے پتّے

خزاں کا خوف مسلط ہے اس طرح ثروت
کبھی ہوا بھی چلی ہے تو ڈر گئے پتّے
***

مدّت کے بعد آج ملے ہیں تو آیئے
کچھ میرا حال پوچھیے، اپنی سنایئے

اک اجنبی خیال کو عنوان کیجیے
جو دل میں قید ہے اسے کاغذ پہ لایئے

اتنا سکوت ہے کہ الجھنے لگی ہے سانس
خاموشیوں کی جھیل میں پتھر گرایئے

تنہائیوں کی دھوپ نے جھلسا کے رکھ دیا
یادوں کے سائبان میں خود کو چھپایئے

پھر آسماں کے رخ پہ بکھرنے لگے ہیں رنگ
پردوں کی گرد جھاڑیے، کمرے سجایئے

***

راہ سے ناآشنا بھی راہبر ہونے لگے
راستوں کے سنگ بھی اب ہمسفر ہونے لگے

کس قدر گمبھیر ہے تاریکیوں کا سلسلہ
چاندنی کے دائرے بھی مختصر ہونے لگے

گھر سے باہر شہر کی جلتی ہوئی سڑکوں پہ آ
ہم پہ جو بیتے ہے تجھ کو بھی خبر ہونے لگے

وقت کی زنجیر میں جکڑے ہوے ہیں ذہن ودل
ہاں مگر ایسا نہ ہو، یوں ہی بسر ہونے لگے

نام کی تختی ہماری اور گھر ہے غیر کا
دوستو سنتے ہو اب ایسے بھی گھر ہونے لگے
***

آنگن تمام نیم کے پتّوں سے بھر گیا

جھونکا ہوا کا پیڑ کو ویران کر گیا

چہرہ تھا کوئی جس نے پریشاں رکھا مجھے
لمحہ تھا کوئی جس کے لیے دربدر گیا

حدِ نگاہ تک یہ کڑی دھوپ اور آج
بادل کا سائباں بھی جانے کدھر گیا

یا لفظ لفظ بھولنا اس کا محال تھا
یا حرف حرف ذہن سے میرے اتر گیا

کس طرح سے کٹے گی سفر کی سیاہ رات
ثروت اسی خیال میں دن بھی گزر گیا
***

میں کہ سورج کے شہر میں رہ کر
روشنی کے لیے ترستا ہوں

ہر طرف دھند، کہر، خامشی

کن فضاؤں میں سانس لیتا ہوں

سرد خاموشیوں کے جنگل میں
دل بھی دھڑکے تو چونک اٹھتا ہوں

ایک بے نام آگ ہے جس میں
دھیرے دھیرے سلگتا رہتا ہوں

جب بھی کچھ زخم بھرنے لگتے ہیں
تیری تصویر دیکھ لیتا ہوں

دوستو، اپنے گھر کے دھوکے میں
جانے کس گھر پہ آن پہنچا ہوں
***

پھر دبے پاؤں کوئی گزرا ہے
وہم ہے یا ہوا کا جھونکا ہے

گھر سے نکلے تو یہ ہوا معلوم

گھر سے باہر بھی ایک دنیا ہے

دور بادل کے ایک ٹکڑے پر
سائباں کا گماں ہوتا ہے

کوئی پتّا گرے جو ٹہنی سے
شب کا سناٹا چیخ اٹھتا ہے

خامشی پر نہ جایئے ثروت
یہ بھی حالات کا تقاضا ہے
***

بھیگی شاخوں پہ سو گیا ہے چاند
آج پتھر کا ہو گیا ہے چاند

چاندنی کی پھوار برسا کر
شب کا پیکر بھگو گیا ہے چاند

دشتِ ماضی میں چھوڑ کر مجھ کو

جانے کس سمت کو گیا ہے چاند

اے ستارو، ذرا تلاش کرو
کن اندھیروں میں کھو گیا ہے چاند

اب کسے نیند آئے گی ثروت
دل میں کانٹے چبھو گیا ہے چاند
***

نیند کا سونا مری آنکھوں سے پگھلا دیر تک
میں گزشتہ رات بھی بے بات جاگا دیر تک

لکھ گیا ہے جانے کیا چہرے پہ لمحوں کا غبار
دیکھتا رہتا ہوں آئینے میں چہرہ دیر تک

اس گلی کے سارے گھر خاموش تھے، تاریک تھے
جانے کیوں روشن رہا تھا اک دریچہ دیر تک

چاپ ابھری اور پھر خاموشیوں میں کھو گئی

اک مدھر نغمہ مرے کانوں میں گونجا دیر تک

میں اکیلا تھا سڑک پر دور تک کوئی نہ تھا
وہ نہ جانے کون تھا، کس نے پکارا دیر تک
***

شاخوں کے زرد ہات لپکتے ہی رہ گئے
پتوں کا تاج پل میں اڑا لے گئی ہوا

کل جس نے رکھ دیے گھنے جنگل اجاڑ کر
در آئی بستیوں میں وہی سر پھری ہوا

کچھ دور میرے ساتھ چلی تھی خبر نہیں
تھک کر کہاں پہ بیٹھ گئی آپ ہی ہوا

چہرے کے نقش درد کی تشہیر بن گئے
مجھ کو نہ راس آئی ترے شہر کی ہوا

آیا تھا ایک شخص مجھے پوچھتا ہوا

اک بات تھی ذرا سی مگر لے اڑی ہوا

***

وہ گیا تو گھر اکیلا ہو گیا

دل بجھا تو شہر سونا ہو گیا

ہر نئے غم نے مجھے آواز دی

میں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا

تیز تھا جھونکا نئے لمحات کا

بند یادوں کا دریچہ ہو گیا

اس کی باتوں پر تو سب خاموش تھے

میں نے لب کھولے تو چرچا ہو گیا

گھر سے باہر جانے کیا حالات ہیں

گھر سے نکلے ایک عرصہ ہو گیا

***

روشن ہوں کسی کو کیا خبر ہے
سورج کی طرح دہک رہا ہوں

پھولوں کی طرح تھا نرم و نازک
کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہوں

خاموش ہیں کھڑکیوں کے پردے
سیلی ہوئی چھت کو تک رہا ہوں

محسوس تو کر رہا ہوں ثروت
کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا ہوں
***

نہ جانے کون ہوں، کیسا ہوں، کیا ہوں
سوالوں میں الجھ کر رہ گیا ہوں

کچھ ایسے غم دیے ہیں دوستوں نے
خود اپنے سائے سے ڈرنے لگا ہوں

انھی کمروں کی رونق تھا مگر اب
میں اک سنّاٹا بن کر گونجتا ہوں

اکیلا پن، تھکن، ویران آنکھیں
جو بیتی ہے وہی کچھ لکھ رہا ہوں

ہر اک لمحہ نئی الجھن نیا غم
نہ جانے کس مرض میں مبتلا ہوں

میں اک اڑتا ہوا پتّا ہوں ثروت
کسی اندھے کنویں میں گر رہا ہوں

***

کھڑکی کھول کے یار و باہر دیکھ رہا ہوں
دھوپ کھلی ہے شہر کا منظر دیکھ رہا ہوں

آج نہ جانے کیسے رستہ بھول گیا ہے
بادل کا اک ٹکڑا چھت پر دیکھ رہا ہوں

جانے مجھ سے تنہائی میں کیا کہتی ہیں
لمحوں کی تحریریں پڑھ کر دیکھ رہا ہوں

دنیا سے تو روز ہی ملتا رہتا ہوں
آج میں اپنے آپ سے مل کر دیکھ رہا ہوں

بازاروں کی اس رونق میں شام ڈھلے
چہروں کا خاموش سمندر دیکھ رہا ہوں

آنگن میں سوکھے پتوں کا ڈھیر لگا ہے
ثروت تیز ہوا کے تیور دیکھ رہا ہوں
***

کسی آہٹ پہ یارو چونکتا کیا؟
میں اک سائے کے پیچھے دوڑتا کیا؟

سڑک کا شور گھر میں آ گیا ہے
ہواؤں سے دریچہ کھل گیا کیا؟

مری آنکھیں کہاں تک ساتھ دیتیں
اندھیرا اس قدر تھا، سوجھتا کیا؟

میں خود اپنے لیے ہی اجنبی تھا
کسی کو شہر میں پہچانتا کیا؟

اندھیرا، آخری گھر تک اندھیرا
گلی کا لیمپ اندھا ہو گیا کیا؟

لکھی ہیں چہرہ چہرہ داستانیں
کسی کا حال یارو پوچھتا کیا؟

بھلا ان منجمد لہروں پہ ثروت
میں آوازوں کے پتھر پھینکتا کیا؟
***

شہر میں اب تو دور تلک سنّاٹا ہے
سڑکوں سے اک شور اٹھا تھا ڈوب گیا

دروازے پر آہٹ سی محسوس ہوئی
کمرے میں اک سایہ ابھرا ڈوب گیا

ماچس کی اک تیلی نے سگرٹ سلگایا
پل بھر کو اک شعلہ بھڑکا، ڈوب گیا

آنکھوں میں بے خوابی کا طوفان اٹھا
ان دیکھے خوابوں کا جزیرہ ڈوب گیا

سُونا گھاٹ تکا کرتا ہے لہروں کو
کشتی کھینے والا لڑکا ڈوب گیا
***

آج کھڑکی سے جو باہر دیکھا
اپنے سائے کو سڑک پر دیکھا

خامشی چھائی تھی گلیوں گلیوں
اور کہرام سا گھر گھر دیکھا

یوں تو ہر شخص کو مخلص پایا
ویسے ہر ہات میں پتھر دیکھا

کون رکتا ہے کسی کی خاطر
کس نے رستے میں پلٹ کر دیکھا

ایک اڑتے ہوے پتّے کی طرح
خود کو لمحات کی زد پر دیکھا

ہم نے جس آنکھ میں جھانکا ثروت
ایک خوابوں کا سمندر دیکھا

***

سنتے ہیں زندگی تھی کبھی شوخ و شنگ بھی
اب ایک واہمہ ہے یہاں روپ رنگ بھی

خود کو ذرا بچا کے نکلیے کہ اِن دنوں
پھولوں کے ساتھ ساتھ برستے ہیں سنگ بھی

یارو چلے ہو جلتی ہوئی دھوپ میں کہاں
دیکھو جھلس گیا ہے کواڑوں کا رنگ بھی

چھت ٹین کی تھی، ٹوٹ کے برسی جو کل گھٹا
بارش کے ساتھ ساتھ بجے جلترنگ بھی

ہم تازہ واردانِ غزل سے نہ کچھ کہو
آجائے گا غزل کو برتنے کا ڈھنگ بھی
***

ہوا کے دوش پہ ٹھہرا ہوا مکان گرا
پہاڑ ٹوٹ کے خوابوں کا مجھ پہ آن گرا

بہت اٹھائے تھے سورج کے ناز، لیکن آج
جو سانس لینے کو ٹھہرے تو سائبان گرا

سکوتِ شام کو موجِ ہوا نے توڑ دیا
کھلے کواڑ تو کھڑکی سے پھول دان گرا

قریب کوئی جزیرہ ہو، کچھ عجب تو نہیں
ٹھہر بھی جا، نہ ابھی سے یہ بادبان گرا

بہا کے لے گئی جانے کہاں ندی اس کو
وہ ایک پات جو لہروں کے درمیان گرا

کبھی اٹھیں جو یہاں زرد آندھیاں ثروت
گماں ہوا کہ ابھی سر پہ آسمان گرا
***

کیا جانیے کون ہمسفر تھا
سایہ بھی وہاں بھنور بھنور تھا

تا حدِّ نگاہ رہگذر میں
پھیلا ہوا دھوپ کا نگر تھا

سڑکوں سے پرے کھلی فضا میں
سنتے ہیں کبھی ہمارا گھر تھا

اب شہر میں آکے سوچتے ہیں
صحرا میں سکون کس قدر تھا

یادوں کی کتاب ہات میں تھی
سوکھا ہوا پھول میز پر تھا

آواز تھکی تھکی نہیں تھی
رومال بھی آنسوؤں سے تر تھا

کل رات ہوا کا شور سن کر
سہما ہوا جسم کا شجر تھا

اب خود سے بھی خوف آرہا ہے
میں اپنے تئیں بہت نڈر تھا

گزری ہوئی رُت خیال میں تھی
بکھرے ہوئے خواب کا اثر تھا

راتوں کا طویل درد ثروت

لکھا تو بہت ہی مختصر تھا

***

چلے تھے گھر سے کہ شاید وہ رہگزر آئے
جہاں سکون کی صورت کوئی نظر آئے

گھٹا برس بھی گئی اور پیاس بجھ نہ سکی
چلو بہت ہے یہی زخم کچھ نکھر آئے

بکھر گیا کوئی احساس تو سمٹ نہ سکا
جو خواب روٹھ گئے پھر نہ لوٹ کر آئے

کھلی چھتوں پہ جو سائے چھپے رہے دن بھر
بجھی جو شام تو دہلیز پر اتر آئے

ہوا چلی تو خیالوں کے ان گنت چہرے
مرے وجود کی تنہائیوں میں در آئے

جو نقش گھلنے لگے رات کی سیاہی میں

تھکن سمیٹے ہوئے لوگ اپنے گھر آئے

عذاب اپنے ہی کچھ ایسے نہ تھے ثروت
گناہ گزرے ہوؤں کے بھی اپنے سر آئے

***

بدن کا بوجھ لیے، روح کا عذاب لیے
کدھر کو جاؤں طبیعت کا اضطراب لیے

جلا ہی دے نہ مجھے یہ جنم جنم کی پیاس
ہر ایک راہ کھڑی ہے یہاں سراب لیے

یہی امید کہ شاید ہو کوئی چشم براہ
چراغ دل میں لیے، ہات میں گلاب لیے

عجب نہیں کہ مری طرح یہ اکیلی رات
کسی کو ڈھونڈنے نکلی ہو ماہتاب لیے

سوا ہے شب کے اندھیروں میں دن کی تاریکی

گئے وہ دن جو نکلتے تھے آفتاب لیے

کسی کے شہر میں مانندِ برگِ آوارہ
پھرے ہیں کوچہ بہ کوچہ ہم اپنے خواب لیے

کہاں چلے ہو خیالوں کے شہر میں ثروت
گئے دنوں کی شکستہ سی یہ کتاب لیے
***

پکارتا ہے در و بام سے کسی کا لہو
خراج لے نہ کہیں ہم سے زندگی کا لہو

اسی امید پہ آنکھوں میں رات کاٹی ہے
کہ رائیگاں نہیں جاتا کبھی کسی کا لہو

ثبوت مہر درخشاں ہے آج بھی یارو
شبِ فسردہ کی آنکھوں میں چاندنی کا لہو

نوید جشن چراغاں ہر اک چراغ کی لو

نمودِ فصلِ بہاراں، ہر اک کلی کا لہو

خلوص نہ مہر و وفا کی ہو کس طرح تجدید
کہ دامنوں پر نمایاں ہے دوستی کا لہو
***

ریزہ ریزہ

یہ آئنے میں جو چہرہ دکھائی دیتا ہے
نہ جانے کون ہے مجھ سا دکھائی دیتا ہے

جھلستی ریت سے کچھ دور ابر کا ٹکڑا
ہرے درختوں کے ملبوس کو بھگوتا رہا

نہ کوئی چاپ ہی ابھری، نہ کوئی در ہی کھلا
ہوا الجھتی رہی شہر کے مکانوں سے

اس سے پہلے تمھیں نہیں دیکھا
اتنا افسردہ، اس قدر خاموش

کیا دھوپ سے گلہ کہ اب ہم
سائے میں جھلس جھلس گئے ہیں

آئے تھے کبھی جو گھر کے بادل
کیا جانیے کہاں برس گئے ہیں

مرے قریب اگر بولیے تو آہستہ
تصوّرات کے آئینے ٹوٹ جاتے ہیں

پھر آج تیز ہوا نے بجھا دیے ہیں چراغ
پھر آج حدِ نظر تک دھواں سا پھیلا ہے

نگر نگر تیری یادوں کی باس پھیلی ہے
گلی گلی مری تنہائیوں کا چرچا ہے

دیکھا تو بے کراں تھے یارو
سوچا تو سمٹ گئے اندھیرے

***

!

میں صدیوں سے اس سوچ میں مبتلا ہوں

کہ جانے کہاں آگیا ہوں

جہاں ہر گھڑی

سر پہ جلتی ہوئی دھوپ کی تیزیاں ہیں

جہاں ہر طرف

سرد سمٹی ہوئی خامشی ہے

گھٹن ہے ——————

جہاں زندگی

سردیوں کی گھنیری سیہ رات ہے

جس کی یخ بستگی

سب کے جذبات پر چھا گئی ہے

جس کی بے منظری سے ہر اک آنکھ پتھرا گئی ہے

جہاں چاندنی

مل کی چمنی سے نکلے دھویں کی طرح

سانس پر بوجھ ہے

اور میں اب تلک

بس اسی سوچ میں مبتلا ہوں

کہ جانے کہاں آ گیا ہوں

***

کھڑکیاں کھول دو

کھڑکیاں کھول دو

بند کمرے میں تازہ ہوا آئے گی

سوچ کی برف پگھلے

نئے دن کا سورج نئی گرمیاں لے کے آئے

خیالات کی نیند ٹوٹے

کوئی گیت ابھرے، گھٹن دور ہو

گھر کی سب کھڑکیاں کھول دو ———

***

تلاش

جیسے بے کل ہَوا

شہر در شہر، صحرا بہ صحرا پھرے

جانے کیا ڈھونڈتی ـــــ

شہر کے لوگ بھی، اس ہوا کی طرح

تنگ گلیوں میں، سڑکوں پہ

بازار میں

جانے کیا ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟

***

سورج کی راکھ

دن بجھا

زرد اینٹوں کی دیوار پر

شام لمحہ بہ لمحہ اترنے لگی

اونگھتی کھڑکیوں سے پرے

اک طرف

لیمپ کی ملگجی روشنی

تھرتھرانے لگی

اور پھر، دیکھتے دیکھتے

سائے ابھرے، ہیولے بکھرنے لگے

زرد اینٹوں کی دیوار پر
رقص کرنے لگے
***

چاپ

دن گزر گیا یارو!
سو گئے ہیں ہنگامے
رات کی پناہوں میں
وقت پا بجولاں ہے
نیم وا دریچوں سے
جھانکتی ہے تاریکی
اونگھتی ہوئی سڑکیں
روشنی گریزاں ہے
سلسلہ خیالوں کا
ٹوٹنے نہیں پاتا
ذہن کی نگاہوں میں
سوچ کا بیاباں ہے
جاگتا تو ہوں لیکن

خواب بُن رہا ہوں میں
آنے والے لمحوں کی
چاپ سن رہا ہوں میں
رات کی پناہوں میں
وقت پا بجولاں ہے
***